www.shibliinternational.com

January 2021 جنوری

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

جمہوریت میں
آمریت، فسطائیت اور فرقہ پرستی
نہیں ہے

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

Issue35 شمارہ_Vol:3 جلد

جنوری Jan :2021

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، مولانا عبدالوحید ندوی، مولانا احمد نورعینی، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 13271024000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

قیمت فی شمارہ:20 سالانہ:220
رجسٹرڈ ڈاک:350- بیرونی ممالک:50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob:9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط: (۳۲)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	نجات کا اٹل قانون	مرسلہ: حبیب الدین	۱۱
۵	حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر رحیم رامش	۱۳
۶	محمد بن زکریا اور میڈیکل میں ان کی خدمات	مفتی امانت علی قاسمی	۱۴
۷	منفرد مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز کالم نگار کی حیثیت سے	مولانا انصار احمد معروفی	۱۶
۸	نئے سال کا سورج نئی صبح وامنگ کے ساتھ طلوع کیا جائے	ڈاکٹر آصف لئیق ندوی	۱۹
۹	جمہوریت کی لاش	نیاز جیراج پوری	۲۲
۱۰	اردو سفرنامے کی تاریخ میں خواتین ہند کی خدمات	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۲۳
۱۱	ایک کہانی چھ ادیبوں کی	ظفر الاسلام	۲۹
۱۲	بت کدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھ	احمد نور عینی	۳۳
۱۳	ڈاکٹر راحت اندوری بحیثیت شاعر	محمد احتشام انصاری	۳۸
۱۴	رپوتاژ (رسم اجراء ''افکارِ زاہد'' ومشاعرہ)	ولی محمد زاہد ہریانوی	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

کھوئے ہوئے پر جشن کیسا؟ پھر بھی عیسوی ۲۰۲۱ء کا نیا سال، جوش وخروش اور جشن میں پھیکا رہ گیا۔ کیونکہ پوری دنیا چند ناعاقبت اندیش کے فیصلے سے کرب وکسک میں مبتلا ہوئی۔ ان کے عزائم ومقاصد کیا ہیں، آنے والا وقت بتائے گا، تادمِ تحریر تقریباً دنیا کا ہر شخص متاثر اور آزمائش میں نظر آتا ہے۔ اے بارِالٰہا ہمیں مصائب وآلام سے نجات دے آمین۔

ہمارے ملک ہندوستان کے لیے جنوری کا مہینہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس ماہ کی ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء سے آئین ہند کا نفاذ عمل میں آیا، اسی مناسبت سے ۲۶ر جنوری کو ہر سال سرکاری طور پر جشن یوم جمہوریہ منایا جاتا ہے۔ آئین ہند میں بھارتی شہریوں کے بنیادی حقوق، رہنما اصول اور ان کی ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ آئین ہند دنیا کا سب سے ضخیم تحریری دستور ہے۔ اس کی مجلسِ مسودہ سازی کے صدر ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیڈکر تھے۔ آئین ہند کی تمہیدی ابتدائی چند سطریں ہر ہندوستانی کو یہ حلف دلاتی ہیں کہ ''ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی غیر مذہبی عوامی جمہوری بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔ انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی، آزادیٔ خیال، اظہار، عقیدہ دین اور عبادت، مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں اخوت کو ترقی دیں، جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو''۔

اہم شخصیات کے وفیات کا سلسلہ جاری ہے انہیں میں ممتاز ادیب، اسکالر، مورخ ومخیر ماہر اقبالیات ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب ۲۰ر جنوری کی صبح لندن میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، مرحوم نے پوری زندگی، توانائی مغربی ومشرقی ممالک میں اردو زبان وادب اور شخصیت کی ترقی پر وقف کر رکھی تھی۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت، جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے آمین۔ ادارہ آپ کی علمی وادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

۲۰ر جنوری ہی کو سحر کے وقت کلمہ کا ورد کرتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ باکمال استاد شاعر کئی ادبی انجمن کے سرپرست وصدر، دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف بالخصوص شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے سرپرست اور ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے مشیر اعلیٰ استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰنؒ جامی ہزاروں شاگردوں ومحبین کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت، جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے آمین۔ ادارہ اپنے سرپرست اور مشیر اعلیٰ کی ادبی، علمی اور انسانی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور اپنے تمام قارئین وقلمکار سے گزارش کرتا ہے کہ ہمارا مارچ کا شمارہ ''حضرت رحمٰن جامی نمبر'' ہوگا، اس وجہ سے اپنے تاثراتی، تحقیقی، تنقیدی مضامین وتخلیقات جس کا تعلق حضرت رحمٰنؒ سے ہے۔ ہمارے میل پر ان پیج فائل میں ضرور ارسال کریں۔ (شکریہ)

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

صدقہ سے پرہیز:

آنحضرت ﷺ اپنے خاندان کے لیے صدقہ وزکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ وعار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر پاتا ہوں، جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لیے ڈال دیتا ہوں۔

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آ گئی، فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا کہ تو میں اس کو کھا جاتا۔

ایک بار امام حسنؓ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپؐ ڈانٹ کر کہا ''کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا۔'' پھر منہ سے اگلوا دیا۔

آپؐ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لے کر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ کہتا قبول فرماتے اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ ہے تو آپؐ ہاتھ روک لیتے اور دوسروں صاحبوں کو عنایت فرما دیتے۔

ہدایا اور تحفے قبول کرنا:

(دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے، بلکہ آپؐ نے اس کو ازدیادِ محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے:

تهادوا تحابوا

باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔

اسی لیے صحابہؓ عموماً کچھ نہ کچھ روز آپؐ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے، جس دن آپؐ حجرۂ عائشہؓ میں قیام فرماتے تھے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی چیز آپؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپؐ دریافت فرماتے تھے کہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے، ورنہ احتراز کرتے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپؐ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپؐ نے ان کو عنایت فرما دی)۔

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے، حدودِ شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیز مصر نے ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے آپ کو موزے بھیجے تھے۔

ایک دفعہ قیصرِ روم نے آپؐ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی، آپؐ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علی کے بھائی) کے پاس بھیج دی، وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو'' عرض کی، پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو۔ حضرت جعفرؓ ایک مدت یعنی فتحِ خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے ان ہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

ہدایا اور تحفے دینا: (جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے، ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے **كان يقبل الهدية ويثيب عليها** ۔ آنحضرت ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے) یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی، اس نے آنحضرت ﷺ کو ایک قیمتی حلہ بھیجا، جس کو اس نے ۱۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا، آپؐ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حلہ ہدیتاً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دے کر خریدا گیا تھا۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے ڈائرکٹر اور ماہنامہ معارف کے مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (پ:۱۹۴۲ء) کی شبلی اور ان کی فکر ونظر پر گہری نگاہ ہے، انگریزی اور اردو میں انھوں نے متعدد مقالات لکھے ہیں، علامہ شبلی کی کئی نادر تحریریں، مراسلات اور قصائد وغیرہ ان کی دریافت ہیں، جنھیں انھوں نے معلومات افزا حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، یہی نہیں انھوں نے علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش کی بھی تعیین کی ہے۔ ۴؍جون ۱۸۵۷ء کی تاریخ انہی کی طے کردہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا اسلوب نگارش خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ بڑی شستہ اور شگفتہ نثر لکھتے ہیں، دوسرے موضوعات پر ان کی جو کتابیں مقالات ہیں ان میں بھی یہ جوہر موجود ہے۔

دار المصنفین کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انھوں نے مطبوعات دار المصنفین پر جو دیباچے لکھے ہیں وہ خاصے اہمیت کے حامل اور قابل ذکر ہیں۔

۲۰۱۱ء میں راقم نے کتابیان شبلی مرتب کی جسے دار المصنفین نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کی علمی، تحقیقی، ادبی اور ملی خدمات کی وجہ سے ان کی حیات اور کارناموں کے بارے میں خود ان کی زندگی میں بہت کچھ لکھا گیا اور اس کے بعد مسلسل لکھا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان پر اتنا کام نہیں ہوسکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اس کے باوجود ان کی گوناگوں خدمات کے بارے میں گذشتہ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے بہت وقیع ہے''۔ (کتابیات شبلی ص۱۰)

دار المصنفین نے ۲۰۱۳ء میں راقم کی کتاب آثار شبلی شائع کی۔ اس میں علامہ شبلی کی تمام دستیاب علمی وادبی اور تاریخی تحریروں کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے، دراصل یہ حیات شبلی کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں شبلی کی علمی کاوشوں اور ان کی حیرت انگیز کوششوں اور کاوشوں کے بارے میں ظلی صاحب لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نعمانی ایک عبقری، عہد ساز اور کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی خدمات، علم وادب اور تحقیق وتصنیف تک محدود نہیں ہیں جو اصل میدان کار تھا۔ بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مسلمانوں کی علمی، فکری، ملی، دینی، سماجی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو ان کی مختصر زندگی میں کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ علم وتحقیق کے میدان میں انھوں نے ایک ایسی روایت کی طرح ڈالی جو مغرب میں رائج معیار تحقیق سے ہم آہنگ تھی اور اس وقت تک برصغیر کے علمی حلقوں میں معروف نہیں تھی۔ ان کے قلم سے سیرۃ النبی اور الفاروق جیسے شہ پارے نکلے جن کی اہمیت، معنویت

اور ندرت ایک صدی بعد بھی ویسے ہی قائم ہے۔ علم وادب، تحقیق وتصنیف اور تعلیم کے فروغ اور توسیع کے میدان میں ان کی خدمات غیر معمولی حیثیت کی حامل ہیں۔ اور ان میں متعدد کو علمی دنیا میں اولیات کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیق وتصنیف کے میدان میں ان کے کارناموں میں بڑا تنوع ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر یہ شاہکار تصنیفات ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلی ہیں۔ مسلسل بیماریوں اور بے شمار موانع ومشکلات کے باوجود ایک مختصر زندگی میں انھوں نے جو کچھ کر دکھایا اسے غیر معمولی ہی کہا جاسکتا ہے''۔ (آثار شبلی ص ۱۳)

آثار شبلی کے زمانہ تصنیف میں الندوہ کے شذرات شبلی پر نظر گئی جو سو برس سے اس کی فائلوں میں پڑے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ کی ایک ایک تحریر شائع کردی ہے، غالباً اس کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا ورنہ وہ اسے ضرور شائع کرتے۔ چنانچہ راقم نے ان کی جمع وترتیب کا کام شروع کیا، الندوہ کے شمارے کسی لائبریری میں یکجا نہیں تھے، اس لئے مختلف کتب خانوں کا چکر لگایا، بہر حال ایک برس کی مسلسل تگ ودو کے بعد انھیں مرتب کرنے میں کامیابی ملی، شبلی صدی کے موقع پر دار المصنفین نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا اور ڈائرکٹر دار المصنفین نے شذرات شبلی کو قدر دانان شبلی کے لئے ایک نادر تحفہ قرار دیا، اس کے دیباچہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے شبلی کی خدمات ندوہ کا ایک عمدہ مرقع پیش کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہین:

''ندوہ میں قیام کے دوران علامہ شبلی نے جو بڑے علمی اور ملی کام انجام دیئے ان میں اپنے نتائج کے لحاظ سے ماہنامہ الندوہ کے اجرا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ الندوہ صرف ایک اعلی درجہ کا علمی وتحقیقی مجلّہ ہی نہیں تھا جس میں بڑے بلند پایہ مضامین چھپتے تھے بلکہ اس نے ایک علمی تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ایک طرف اس نے نئی تعلیم یافتہ نسل کو مسلمانوں کے مذہبی اور علمی کارناموں سے روشناس کیا تو دوسری طرف طبقہ علماء کو نئے زمانے کی ضروریات، تقاضوں اور اسلوب سے آگاہ کیا اور انھیں اسلام اور تاریخ اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے علمی اور تحقیقی جواب بھی فراہم کئے گئے۔ علماء اور مدارس اسلامیہ میں زیر تعلیم طلبہ کو تحقیق وتصنیف کے نئے اسلوب اور انداز سے متعارف کیا اور انھیں اپنے علمی ذخیروں کو استعمال کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نوجوان علماء اور طلبہ کے اندر علمی موضوعات پر لکھنے کا شوق اور سلیقہ پیدا ہوا۔ ان میں سے کئی نے علم وادب کی خدمت میں بڑی ناموری حاصل کی اور تصنیف وتالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح نئے لکھنے والوں کی علمی اور تصنیفی تربیت میں الندوہ کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ (شذرات شبلی ص ۱۱)

علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات کے مطالعہ میں شذرات شبلی سے اب تک اہل علم نے استفادہ نہیں کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ کے نہ صرف تعلیمی نظریات بلکہ اس سلسلہ میں ان کی جدوجہد کا ایک منظر نامہ ان شذرات میں محفوظ ہے۔

۲۰۱۳ء میں دار المصنفین نے ڈاکٹر شمس بدایونی کے مضامین کا مجموعہ ''شبلی کی ادبی وفکری جہات'' شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی نے جتنے متنوع اور کثیر الجہات موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اردو زبان وادب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ انھوں

نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی ان کا موضوع اختصاص تھا اور اسی کی تحصیل ان کی عمر کا حاصل۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان کے افکار اور ان کی تصنیفات اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران ان کی تصنیفات کی ایک تسلسل سے نکلنے والی اشاعتیں ان کی مقبولیت کی شاہد ہیں"۔ (شبلی کی ادبی وفکری جہات ص ۵)

۲۰۱۴ء شبلی صدی کا سال تھا چنانچہ ہند و پاک کے مختلف شہروں میں اس کی تقریبات منعقد ہوئیں خود دار المصنفین نے اس کا بڑا اہتمام کیا، چار روزہ بین الاقوامی سمینار کے علاوہ متعدد کتابیں علامہ کی حیات وخدمات پر شائع ہوئیں، اسی سلسلہ میں دار المصنفین نے ڈاکٹر آفتاب صدیقی کی کتاب "شبلی ایک دبستان" بھی شائع کی۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر ظلی نے نہ صرف کتاب کی اہمیت کا ذکر کیا ہے بلکہ مصنف کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ حیات شبلی محض سوانح عمری ہے اور سید صاحب اسی وجہ سے اس کا ایک حصہ قلم بند کرنا چاہتے تھے جو نہ ہوسکا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ظلی صاحب نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس سے پہلے راقم کی کتاب آثار شبلی شائع ہوچکی تھی جس میں اب تک کے دستیاب علامہ کے علمی مواد اور ذخیرہ تصنیفات کا مکمل جائزہ پیش کیا جاچکا تھا۔

شبلی صدی کے موقع پر دار المصنفین نے جو اہم کتابیں شائع کیں اس میں ایک کتاب "شبلی کی آپ بیتی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے علامہ شبلی کی غیر معمولی شخصیت اور ان کی مساعی جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"علامہ شبلی نعمانی غیر معمولی حالات میں پیدا ہونے والے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ مختصر فرصت حیات میں بیماری کے شدید اور طویل وقفوں اور سخت ذاتی مسائل اور مصائب کے باوجود انھوں نے جو علمی وفکری ورثہ چھوڑا ہے وہ حیرت انگیز ہے، لیکن دین وملت کے لئے ان کی خدمات اور احساسات یہیں تک محدود نہیں بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ ان کی کثیر الجہات شخصیت کا محض ایک پہلو ہے۔ مبدء فیض سے ان کو دردمند دل عطا ہوا تھا، دین وملت کے لئے دردمندی اور دل سوزی ان کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو تھا، جس دردمندی، دل سوزی اور حوصلہ سے ملی مسائل کے لئے انھوں نے کوشش کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (شبلی کی آپ بیتی ص ۷)

علامہ شبلی کے سیاسی اور علمی وفکری اثرات کا مطالعہ اب تک ہمارے اہل قلم کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ظلی نے لکھا ہے کہ:

"برصغیر کے مسلمانوں کی دینی، ملی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے خطے میں مسلمانوں کے مختلف ادارے، انجمنیں اور تحریکیں علمی، فکری اور عملی سطح پر جو کچھ کررہی ہیں ان کا سرا کہیں نہ کہیں علامہ شبلی سے جا ملتا ہے۔ ماضی کے گہرے مطالعہ اور تجزیہ اور حال کے حقیقت پسندانہ مشاہدہ نے ان کے اندر مستقبل آگاہی کا شعور پیدا کردیا تھا، چنانچہ انھوں نے برصغیر میں مستقبل میں ممکنہ طور پر ابھرنے والی صورت حال کا کسی قدر ادراک کرلیا تھا۔ اسے انھوں نے قوم کے سامنے پوری دل سوزی اور جرات سے پیش کیا"۔ (ایضاص ۷)

کاش کوئی اہل قلم شبلی کے ان افکار کا تسلسل سے مطالعہ کرکے ان کے ذہنی وفکری اثرات واضح کرتا۔

علامہ شبلی کے محققانہ مقالات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں جن کی داد سرسید احمد خاں نے شبلی کو دی تھی۔ قیام علی گڑھ کی یادگاران کے مقالات کا ایک مجموعہ خود علامہ نے ''رسائل شبلی'' کے نام سے مرتب کیا تھا جو ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں شبلی صدی مطبوعات کے تحت دارالمصنفین نے بطور یادگار اسے بھی شائع کیا۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اس کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے چونکہ وہ خود تاریخ کے آدمی ہیں اس لئے ان کے جذبات بھی اس میں آگئے ہیں۔

پروفیسر ظلی صاحب کی شبلی شناسی شبلی صدی بین الاقوامی سمینار کی رپورٹ اور روداد سے پورے طور پر سامنے آجاتی ہے، اس موقع پر انھوں نے ماہنامہ معارف کا شبلی نمبر بھی شائع کیا، معارف کی تاریخ میں یہ اس کا اگرچہ دوسرا خصوصی شمارہ تھا تاہم وہ اپنے مشمولات اور مقالات کے لحاظ سے ہند وپاک سے شائع ہونے والے تمام خصوصی شماروں پر سبقت لے گیا، اس کی دو بڑی خصوصیات ہیں ایک یہ کہ بعض بالکل اچھوتے اور نئے موضوعات پر مقالات شامل ہیں، دوسرے یہ کہ اس میں کوئی بھی مقالات مطبوعہ شامل نہیں ہے۔

شبلی صدی سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ ظلی صاحب کی ترتیب وتقدیم کے ساتھ ۲۰۱۶ء میں دارالمصنفین نے شائع کیا، اسے ہم شبلی شناسی میں سنگ میل کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اس کا دیباچہ بھی ظلی صاحب نے جی لگا کر لکھا ہے اور علامہ شبلی کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زندگی بھر بیماریوں کا ایسا ساتھ رہا کہ ۵۷ سال کی عمر میں ۸۰ سال کے بوڑھے نظر آتے تھے۔ کثرت مطالعہ سے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ اخیر میں بیماری کی شدت کا یہ عالم تھا کہ بمشکل چند لقمہ غذا رہ گئی تھی اور ایک گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے لکھنے کا کام نہ کرسکتے اور کئی مرتبہ اس سے بھی معذور رہتے۔ اس کے باوجود اپنے پیچھے علم وادب، تحقیق وتصنیف اور عملی خدمات کا اتنا بڑا سرمایہ یادگار چھوڑ گئے کہ ایک صدی کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی اس کے جملہ مضمرات ابھی تک سامنے نہیں آسکے ہیں''۔ (مطالعات شبلی ص ۷)

علامہ شبلی ۱۶ سال علی گڑھ سے وابستہ رہے، اس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی کی خدمات اور اکتسابات کا دائرہ صرف علم ودانش اور تحقیق وتصنیف تک محدود نہیں تھا جو ان کا اصل میدان تھا اور جس اقلیم کے وہ تاجدار تھے، ایم اے او کالج کے تدریسی عملہ میں سرسید کے عہد میں اصحاب کمال کا مجمع تھا لیکن یہ امتیاز صرف ان کو حاصل ہے کہ وہ کالج کے پروفیسر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا شمار سرسید کے اہم رفقا میں ہوتا تھا۔ کالج اور علی گڑھ تحریک کے لئے ان کی خدمات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں، اگرچہ ان کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا اور ان کے بھرپور تعارف وتجزیہ کا کام باقی ہے''۔ (ایضاص ۸)

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد مارچ ۲۰۲۱ء کا شمارہ

معروف ومقبول استاد شاعر — حضرت رحمٰن جامیؒ نمبر — شائع کیا جارہا ہے

قلم کار حضرات سے گزارش ہے کہ اس خصوصی شمارے کے لیے اپنی تحریر اس میل sadaeshibli@gmail.com پر ارسال کریں

مرسلہ: حبیب الدین۔ حیدرآباد

نجات کا اٹل قانون

يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (احزاب) ''(اللہ کی نافرمانی کرنے سے بچنے کی کوشش کرنے اور مضبوط بات کہنے سے) اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کردے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتا ہے، پس یقیناً اس نے بہت بڑی کامیابی پائی''

اللہ کی اطاعت کرنے کے معنیٰ یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر اللہ کی منشاء کے مطابق عمل کیا جائے۔ یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اللہ اپنے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ بندوں کو نہ بتائے۔ چونکہ اللہ غیب میں ہے جس کو کوئی بھی بیداری یا خواب میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے اللہ اپنے احکام پر اپنے منشاء کے مطابق اپنے رسولؐ سے عمل کروا کر رسولؐ کے ذریعہ اپنی اطاعت کا طریقہ بندوں کے لیے فراہم کردیا، اس لیے فرمایا مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء ۸۰) ''جو کوئی رسول کی اطاعت کرے اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی'' اور فرمایا وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء ۶۴) ''ہم نے ہر رسول کو محض اس لیے ہی بھیجا کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے یہی اللہ کا قانون ہے'' اور فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء ۵۹) ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے امیر کی بھی'' ملحوظ رہے کہ ایمان والوں کی اطاعت میں امیر کی بھی اطاعت ہونا لازمی قرار پاتا ہے اور فرمایا وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا (مائدہ ۹۲) ''اور فرمایا کہ تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان کی نافرمانی کرنے سے بچو'' اور نافرمانی کا نتیجہ بھی بتادیا، چنانچہ فرمایا:

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا (النساء ۴۲) ''حشر کے دن کافر (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا انکار کرنے والے) اور رسول کی نافرمانی کرنے والے دلی آرزو کریں گے کہ کاش انہیں مٹی کے برابر کردیا جاتا اور وہ اللہ سے اپنی کوئی بات نہ چھپا سکیں گے''۔

اور نبی ﷺ کی بیویوں کو وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَه (الاحزاب ۳۳) ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی'' کا حکم دیا گیا۔ سورہ مجادلہ ۸ میں رسولؐ کی نافرمانی کرنے کی غرض سے سرگوشیاں کرنے والوں کے لیے جہنم ہے فرمایا گیا اور سورہ طلاق ۸ میں فرمایا کہ بہت ہی ایسی بستیوں کو جو اپنے رب کے احکام اور اس کے رسولوں کے احکام کے خلاف عمل کئے، تو ہم نے دنیا میں اُن سے سخت حساب لیا اور سخت عذاب دیا۔ سورہ الاحزاب میں فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ''اور کسی بھی ایمان والے مرد اور عورت کے جس معاملے میں بھی اللہ اور اس کے رسول نے جب کوئی فیصلہ کردیا ہو (کوئی حکم یا ہدایت موجود ہو) تو اس میں پھر ان کو اب کوئی بھی اختیار نہیں رہتا (اپنی طرف سے اس میں

کوئی ردّوبدل نہیں کرسکتے) اور جوکوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے، پس وہ یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگیا''۔

اللہ ورسولؐ کی اطاعت کے قانون کی اہمیت بتانے کے لیے فرمایا گیا:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (آل عمران ۳۲) ''کہو اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی، پھر اگر وہ منہ پھیرلیں تو اللہ پسند نہیں کرتا کافروں کو'' اور فرمایا وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (آل عمران ۱۳۲) ''اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

اور یہی بات سورہ نور ۵۶ میں بھی کہی گئی ہے۔ اور سورہ الانفال میں فرمایا گیا وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ''اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو'' سورہ یٰسین میں فرمایا گیا يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ''بڑا ہی افسوس ہے بندوں پر جو رسولؐ بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے'' اور سورہ الفرقان ۲۷ میں فرمایا گیا اور حشر کے دن ظالم اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا ہائے کاش کہ میں رسولؐ کا طریقہ اختیار کیا ہوتا'' اور سورہ الاحزاب میں فرمایا:

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ''اس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے (حسرت وافسوس سے) وہ کہیں گے کہ کاش ہم اللہ ورسولؐ کی اطاعت کیے ہوتے''۔

شیطان کے وسوسوں پر عمل کرنے والا شیطان کی عبادت کرنے والا ہے۔ شیطان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (یٰسین ۶۰) ''اے آدم کی اولاد ہم نے تم سے نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

شیطان کے وسوسوں پر چلنا دراصل اس کی عبادت کرنا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (البقرہ ۲۰۸) ''اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو'' ایک نافرمانی سے پچھلے تمام نیک اعمال باطل ہوجاتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (سورہ محمد ۳۳) ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو''۔ اور حدیث میں ہے کہ نافرمانی کرنے والے سے ایمان نکل جاتا ہے اور توبہ کرنے پر لوٹ آتا ہے۔

توبہ

گناہ کے ساتھ ہی توبہ پر معافی کی بشارت ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النساء ۱۷) ''اللہ انہیں لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کرلیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا اور وہ سب کچھ جانتا اور حکمت والا ہے''۔

موت کے وقت کی توبہ قبول نہیں وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ (النساء ۱۸) ''اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو بُرے کام کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود ہو تو اس وقت کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو حالتِ کفر ہی میں مرجاتے ہیں''۔

قرآن علم کی کتاب ہے اور علم بھی وہ جو ابدی زندگی کا

ہے ارشاد ہے کہ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (الاعراف ۵۲) ''اور یقیناً ہم ان کے پاس ایک کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے اپنے علمِ کامل سے بہت ہی واضح کر دیا ہے''۔ اس لیے ہدایت حاصل کرنے کے لیے قرآن کو سمجھ کر پڑھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ ایسا کیے بغیر جہل سے چھٹکارا ناممکن ہے۔

علم حاصل کرنے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقل ہی سے انسان نفع ونقصان کو پہچانتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (یونس ۱۰۰) ''جو عقل سے کام نہیں لیتے ان پر گندگی مسلط کر دیتا ہے'' اور فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (الانفال ۲۲) ''یقیناً مخلوق میں بدترین وہ ہیں جو بہرے ہیں اور گونگے ہیں اور ذرا بھی عقل سے کام نہیں لیتے''۔

عقل ہی سے کام نہ لینے کی بناء پر انسان دوزخ میں جائے گا جیسا کہ دوزخی اعتراف کریں وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک ۱۰) ''کہیں گے کہ کاش کہ ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں شامل نہ ہوتے''۔

عقل متضاد اور متخالف باتوں کو تسلیم نہیں کرتی اس لیے پاگل پر شریعت لاگو نہیں ہوتی۔ قرآن کے خلاف کسی بھی بات کو چاہے وہ حدیث کے نام ہی سے کیوں نہ ہو ماننا قرآن کو جھوٹا قرار دینا ہے۔ ایسا کرنے والا سب سے بڑا ظالم ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (انعام ۲۱) ''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے'' اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو صرف وحی کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (انعام ۱۰۶) ''اے محمدؐ! اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر تمہارے رب کی طرف نازل ہوئی ہے۔ یہی بات سورہ یونس ۱۸ اور سورہ احزاب ۲ میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اس حکمِ الٰہی کی تعمیل میں نبی ﷺ کا اعلان ہے کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام ۵۰، یونس ۱۵) ''میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے''۔ اس لیے ہر وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو اور تجربے ومشاہدے میں غلط ہو وہ یقیناً موضوع (گھڑی ہوئی) ہی ہوگی۔ کیونکہ نبی ﷺ کا کوئی قول وفعل قرآن کے ہرگز خلاف اور تجربے اور مشاہدے میں غلط نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر رحیم رامش۔ تلنگانہ

حمد باری تعالیٰ

(نقاط بالا)

اُس کی رحمت کا ہے سہارا
ہوتا ہے دن رات گزارہ
ساری خلقت اس نے سنواری
کتنا دلکش اس کا نظارہ
صدقِ دل سے نام لو اس کا
ہوتا ہے ہر کام تمہارا
دی ہے نماز و قرآں ہم کو
اس کا ہی احساں ہے سارا
اس کو راضی رکھنا ہردم
وہ ہی تو مولا ہے ہمارا
حکمِ خدا دے راہ سمندر
گُل ہوتا ہے ہر انگارہ
اس سے ہی تم مانگو رامش
ہر مشکل کا وہ ہی سہارا

مفتی امانت علی قاسمی استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

طبی انسائکلو پیڈیا ''الحاوی'' کا مصنف
محمد بن زکریا رازی کی طبی خدمات (۲۵۰ھ/۸۶۴ء_۳۱۳ھ/۹۲۵ء)

ابو بکر محمد بن زکریا رازی علم طب کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں، ''رَے'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، تذکرہ نویسوں نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''رازی غریب خاندان کا فرزند تھا، ابتداء میں اس نے معمولی تعلیم حاصل کی اور چودہ پندرہ سال کی عمر تک اپنے وطن ''رَے'' میں کمال بے فکری سے زندگی گذار رہا تھا، عود بجانا، دوستوں کے ساتھ گھومنا، اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا'' (سو عظیم مسلم سائنسداں ص: ۱۴۷)

رازی ابتداء میں کیمیا گری میں مشغول تھا، جس کے لئے اس نے اپنے گھر میں بھٹیاں لگا رکھی تھیں، اس کا گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا، جس سے آنکھوں میں تکلیف پیدا ہوگئی، وہ مجبوراً ایک حکیم کے پاس گیا اس نے پانچ سو اشرفیاں لے کر علاج کیا اور کہا کیمیا وہ نہیں ہے جس میں تم مصروف ہو بلکہ اصل کیمیا یہ ہے۔ (تاریخ الحکما ص: ۶) حکیم کے ان الفاظ نے ان کی زندگی بدل دی؛ چنانچہ اس نے بیوی بچوں اور دوست واحباب کو خیر آباد کہہ کر بغداد کا رخ کیا اور یہاں انہوں نے علی بن سہل کی صحبت میں طب میں مہارت پیدا کی اور محنت وجانفشانی سے اس درجہ کو پہنچا کہ ان کو اس فن کا امام تسلیم کیا جانے لگا، ابن خلکان کہتے ہیں:

''وہ علم طب میں اپنے وقت کا امام تھا اور اس زمانہ میں اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا تھا، وہ فن طب میں کامل اور اس کے اصول وقواعد کا ماہر تھا، علم طب حاصل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس سفر کر کے آتے تھے'' (حکماء اسلام ۱/۲۰۱)

طب میں ان کے اسی کمال اور بے مثال خدمات کی وجہ سے دانشوروں کو کہنا پڑا:

''فن طب مردہ ہوگیا تھا، جالینوس نے زندہ کیا، وہ منتشر اور پراگندہ تھا، رازی نے اسے مرتب کر کے اسے ایک شیرازے میں منسلک کر دیا، وہ ناقص تھا، ابن سینا نے اس کی تکمیل کی'' (ابن خلکان ۲/۷۸)

علمی خدمات اور کارنامے

رازی ایک ماہر طبیب تھا، انہوں نے طب کی بے پناہ خدمت کی، ''رَے'' کے سرکاری ہسپتال میں سپرنٹنڈنٹ کی جگہ خالی ہوئی تو رازی کا ہی تقرر کیا گیا، اس عہدے پر رہتے ہوئے ان کو اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور اپنی قابلیت نکھارنے کا سنہرا موقع ہاتھ لگا، خلیفہ مکتفی کے زمانے میں ان کا تبادلہ بغداد ہوگیا؛ لیکن ۹۰۳ء میں حاکم رے منصور بن اسحاق کی فرمائش پر رازی کو دوبارہ رَے کے سرکاری ہسپتال کا افسر اعلیٰ بنا دیا گیا، رازی پہلا طبیب ہے جس نے ابتدائی امداد (First Aid) کا طریقہ ایجاد کیا اور اس کے رہنما اصول وضع کئے، رازی نے دواؤں کے صحیح وزن کے کے لئے ''میزان طبعی'' ایجاد کیا، یعنی ایک ایسا ترازو جس میں چھوٹی سی چھوٹی چیز کا صحیح صحیح وزن معلوم کیا جاسکتا ہے، الکحل کا موجد بھی رازی کو قرار دیا جاتا ہے، انہوں نے موروثی متعدی امراض کا نظریہ پیش کیا، عمل

جراحی میں ایک کارآمد آلہ بنایا جس کو نشتر کہتے ہیں، رازی کی شخصیت جامع تھی، وہ ایک باکمال فلسفی اور ماہر ہیئت داں تھا، علم طبعیات میں اس کو کمال حاصل تھا۔ (سو عظیم مسلم سائنسداں ص: ۱۴۸)

رازی کی تصنیفات

رازی نے مختلف موضوعات پر دو سو کتابیں تحریر کیں، جن میں آدھی کتابیں طب پر ہیں، ان میں سب سے مشہور کتاب ''الحاوی'' ہے، جو پچیس جلدوں پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں سب سے بڑا طبی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے، اس کتاب میں طب کے ہر مسئلے پر تمام یونانی اور عرب اطباء کی آراء نقل کی گئی ہے، اس کتاب میں یونان و ہند اور ایران کے علوم کو ایک ہی نظام میں مربوط کر دیا گیا ہے، اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ایک یہودی طبیب نے ۱۲۷۹ء میں صقلیہ (سسل) میں کیا تھا، صدیوں تک یہ کتاب مغرب کی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب رہی، اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا پہلا ترجمہ ۱۴۸۶ء میں منظر عام پر آیا تو ۱۵۴۲ء میں اس کا پندرہواں ایڈیشن شائع ہوا، رازی کی دوسری نامور تصنیف ''کتاب المنصوری'' ہے، جو انہوں نے حاکم رے منصور بن اسحاق کے نام معنون کی ہے، یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے، اس کا ترجمہ بمقام ''میلان'' پندرہویں صدی کے اواخر میں ہوا، اس کے چند حصے حال ہی میں فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی منتقل کئے گئے ہیں، رازی کی تیسری تصنیف ''کتاب الجدری والحصبہ'' ہے، یہ پہلا رسالہ ہے جس میں چیچک اور خسرے کی معالجاتی تفصیل بڑی صحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے، رازی سے پہلے کسی سائنسداں نے اس موضوع پر تحقیق نہیں کی تھی، رازی پہلا طبیب ہے، جس نے چیچک کی تشخیص کی اور اس کے اسباب وعلاج تجویز کئے، اس کا ترجمہ پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں ۱۵۶۵ء میں ہوا، اس کے بعد متعدد یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے، اس رسالہ نے رازی کو دور وسطیٰ کے عظیم معالج کی حیثیت سے لازوال شہرت کا مالک بنادیا، اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا، فرنچ، یونان اور جرمنی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، یہ کتاب بھی کئی صدی تک مشرق ومغرب کی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے، رازی کی مشہور کتابوں میں ایک کتاب ''الفصول فی الطب'' ہے، اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا ہے، جو آج بھی لیڈن میں موجود ہے، لاطینی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، ان کی ایک کتاب ''کتاب الطب الملوکی'' ہے، جو والی طبرستان علی بن ویسمو ذان کے نام معنون ہے، یہ کتاب مخطوطہ شکل میں لیڈن کی لائبریری میں موجود ہے۔ ((اسلامی انسائیکلوپیڈیا ص: ۸۱۹، علوم وفنون عہد عباسی میں: ۱۲۶) اس کی ایک اہم تالیف ''کتاب الاسرار'' ہے، اہل مغرب نے بچوں کی ولادت، امراض چشم، آشوب چشم اور امراض نسواں کے سلسلے میں اس کتاب کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔ (عربوں کے علمی کارنامے ص: ۷۰)

رازی کے اندر بے پناہ تصنیفی صلاحیتیں تھیں، وہ ہر وقت لکھتا رہتا تھا، طب کے علاوہ فلسفہ، حکمت، نجوم وہیئت، طبعیات اور عقائد کے متعلق اس کی تصنیفات قابل ذکر ہیں، صدیوں تک مغرب پر رازی کی تصنیفات کا گہرا اثر رہا ہے، اس لئے آج بھی مغرب رازی کے احسان مند ہیں، ۱۹۱۹ء میں لندن میں بین الاقوامی کانگریس نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں رازی کے حیات وکارنامے پر روشنی ڈالی گئی اور اس کا ذکر شاندار مدحیہ الفاظ میں کیا گیا، ۱۹۳۰ء میں رازی کی ہزار سالہ برسی پیرس میں بڑے اہتمام سے منائی گئی اور رازی کو طب کا امام تسلیم کیا گیا۔

اخیر عمر میں رازی نے بصرہ کی مرطوب آب وہوا سے متاثر ہو کر کھانے میں کثرت سے لوبیا کھائی، جس سے آنکھ کی بینائی جاتی رہی، ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ کثرتِ کتابت کی وجہ سے اخیر عمر میں نزول ماء کی شکایت ہوگئی تھی، پھر وہ کچھ لکھ نہ سکا اور ایک طویل عمر پا کر ۹۲۵ء میں ''رَے'' میں وفات پا گیا۔

مولانا انصار احمد معروفی قاسمی۔استاد مدرسہ چشمہ فیض ادری مئو (اتر پردیش)

منفرد مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز کالم نگار کی حیثیت سے

حیدر آباد سے تعلق رکھنے والے طنز وظرافت نگار ڈاکٹر عابد معز کی ادبی شناخت کئی حیثیت سے مسلم ہے، کہ وہ ایک طرف جہاں معزز پیشہ ور طبیب ہونے کے تعلق سے انسانی صحت کی بازیابی واستحکام کے لیے اردو میں طب وغذائیت کے عنوان سے کئی کتابیں لکھ کر منظر عام پر لا چکے ہیں، جن میں ''ذیابیطس کے ساتھ ساتھ'' چکنائی اور ہماری صحت'' کولیسٹرال کم کیجیے'' حج وعمرہ اور ہماری صحت'' اور'' پکوان کا تیل'' وغیرہ کئی کتابیں شامل ہیں، ان میں سائنس اور جدید طب سے متعلق بیش بہا معلومات درج کی گئی ہیں۔ دوسری جانب انھیں اردو ادب سے بے انتہا محبت ہے، جب انسان قلم وقرطاس سے محبت کرنے لگتا ہے تو وہ اولا شوق اور عادت کے طور پر لکھتا ہے، پھر وہی عادت عبادت بن کر قلم کار کے رگ وریشے میں سما جاتی ہے اور وہ للہ فی اللہ لکھنے لگتا ہے۔

چنانچہ اردو ادب کے موضوع پر انھوں نے ''اردو ہے جس کا نام'' لکھ کر اردو سے اپنی بے پایاں محبت کا ثبوت پیش کیا، ڈاکٹر عابد معز صاحب زندہ دل اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں، ان کا ملاقاتی اس بات کا فرحت بخش احساس لے کر لوٹتا ہے کہ ''بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر'' مگر ان کے مزاح میں مذاق اڑانے، تمسخر کرنے، تحقیری رویہ اپنانے اور تکبر کے اظہار کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، وہ دوسروں کی بات ہمہ تن گوش ہوکر سنتے ہیں، اور پھر مکمل ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے جس طرح علاج کرتے ہیں اسی کے مثل مخاطب کے غمہائے روزگار کا علاج کر کے خوش کر دیتے ہیں۔ وہ ''دل بدست آور کہ حج اکبر است'' کی طرح دل خوش کر کے دونوں ہاتھوں سے نیکیاں بٹورتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ڈاکٹر معز صاحب کو طنز وظرافت سے خاصی دلچسپی رہی ہے، اور مزاج میں شگفتگی کی بنا پر انھوں نے مزاح کے موضوع پر اپنا قلم اٹھایا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور متواتر لکھتے چلے گئے۔ چنانچہ کالم نگاری شروع کرنے سے پہلے ہی اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی تھیں، جن میں ان کی پہلی کتاب ''واہ حیدر آباد'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ جب کہ ان کے لکھنے کی ابتدا شگوفہ کے ذریعے ۱۹۸۱ء سے ہو چکی تھی۔ پھر ۲۰۱۱ء میں ان کے شگفتہ افسانوں کا مجموعہ'' عرض کیا ہے'' شائع ہوا۔ پھر اسی موضوع پر دوسرا مجموعہ'' یہ نہ تھی ہماری قسمت'' بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد ۲۰۱۳ء میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''فارغ البال'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

اردو کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین مرحوم نے لکھا ہے، جس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یوں ہے'' اخبار میں کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر قاری کا خون خشک ہو جاتا ہے'' شاید یہی وجہ ہو کہ اس کی تلافی کے لیے اب اکثر اخباروں میں فکاہیہ کالم پابندی سے شائع کیا جانے لگا ہے، کہ قاری کہیں مایوس ہو کر اخبار پڑھنا ہی بند نہ کر دے۔ ایک ہفتہ کے حساب سے اخبارات میں کئی کالم روز بروز شائع کیے جاتے ہیں، اور اخبار کے ہر قسم کے قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کرنے اور تفنن طبع کے واسطے فلم، ادب، ظرافت، خواتین، اطفال، سیاسی میز، انٹرویو، کھیل کود، مستقل اداراتی کالمز، معمے، سوال وجواب، اور مراسلے وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز صاحب چوں کہ طب کے معزز پیشے سے وابستہ ہیں، اس لیے طب وصحت پر ان کی کئی ایک مفید کتابیں منظر

عام پر آئیں، مگر ہمیں بحث ان کی کالم نگاری سے ہے، بالا میں یہ بات آچکی ہے کہ ان کی کئی کتابیں طنز وظرافت پر بھی شائع ہوچکی ہیں، لیکن باقاعدہ کالم نگاری کی ابتدا انھوں نے سعودی عربیہ جانے کے بعد کی، لکھنے پڑھنے سے تعلق تو انھیں پہلے سے تھا، وہاں یہ کب اور کیسے پہنچے؟ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں "۱۹۸۷ء میں میرا تقرر سعودی عرب کی وزارت صحت میں طبیب اختصائی تغذیہ کی حیثیت سے ہوا، اور میں سعودی عرب چلا گیا، میں ریاض سعودی عرب میں کچھ کم ربع صدی مقیم رہا، یوں میری ادبی زندگی کا تقریبا ـــــ وقت اردو کی ایک نئی بستی سعودی عرب میں گزرا۔ سعودی عرب کے شہر جدہ سے جب سنہ ۱۹۹۹ء میں عرب دنیا کے پہلے ہفت روزہ "اردو میگزین" کا آغاز کیا گیا تو ایک صفحہ میرے لیے مختص ہوا، میں اس صفحہ پر فکاہیہ کالم تحریر کرنے لگا، اردو میگزین کے جملہ ۵۵۵/شمارے شائع ہوئے اور دس برس سے زیادہ عرصہ تک چھپنے کے بعد ۳۰/اکتوبر میں اردو میگزین بند ہوا۔ اس طرح میری کالم نگاری بھی موقوف ہوگئی"۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں "کالموں کے چار مجموعے "بات سے بات" اتنی سی بات" اور وہاں کی بات" بھی شائع ہوئے، اس طرح اب تک طنز ومزاح کی میری نو کتابیں منظر عام پر آئیں، صحت وطب اور تغذیہ کے میدان میں اب تک میری گیارہ کتابیں اور دس کتابچے شائع ہوچکے ہیں"۔ پیش لفظ آئی گئی بات۔ ص ۱۰۔

ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے کالم نگاری صرف "اردو میگزین" کے لیے کی، بلکہ حیدر آباد کے مشہور اخبار "اعتماد" کے لیے بھی فرمائش پر سعودی عرب میں قیام کے دوران شروع کی۔ وہ لکھتے ہیں "جناب احمد الدین اویسی نے سنہ ۲۰۰۶ء کے اوائل میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنے کالموں کو روزنامہ اعتماد حیدر آباد میں چھپنے کے لیے دوں، موصوف کی فرمائش کے جواب میں میں نے اعتماد کے لیے الگ سے کالم لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا، اس خیال کو احمد الدین اویسی نے سراہا اور پسند کیا، یوں ہر دوشنبہ کو روزنامہ اعتماد کے ادبی سپلیمنٹ "اوراق ادب" میں میرا کالم شائع ہونے لگا، تقریبا ڈھائی برس چھپتا رہا جب شاید جنوری ۲۰۰۸ء میں چار سے صرف ایک صفحہ کردیا گیا تو جگہ کی تنگی کے سبب میرا یہ کالم" (پھر چھڑی بات)" بند ہوا"۔ پھر چھڑی بات، ص ۹۔

ڈاکٹر معز صاحب کو اردو ادب کی صنف طنز و ظرافت سے بے انتہا لگاؤ اور قلبی تعلق ہے، اس صنف کے ذریعے وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی انارکی اور برائیوں کی جانب ایسے انداز میں طنز کرتے ہیں جس میں مزاح کی چاشنی کی آمیزش ہوا کرتی ہے، اس کی وجہ سے کڑوی بات سن کر بھی انسان برافروختہ ہونے کے بجائے اس کی اصلاح کی فکر میں محو ہوجاتا ہے، اس طرح کے اقدام سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی بھی سلامت رہ جاتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے پیشے کے اعتبار سے بے حد مشغول ہونے کے باوجود اتنے مضامین کس طرح سپرد قلم کرلیتے ہیں؟ اور کس طرح طبابت وحکمت سے یکسو ہوکر ادب کی خدمت میں مصروف ہوجاتے ہیں، اسی کے ساتھ مختلف اخبارات ورسائل میں سائنسی مضامین اور طب وصحت وتغذیہ کے موضوع پر لکھنے کے علاوہ طنز ومزاح کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں؟ اردو ادب ان کی شناخت بلکہ جان ہے، کالم نگاری ان کی پہچان، اور طنز وظرافت تو ان کا نصب العین ومقصود ہے۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو جب بھی مطب سے فرصت ملتی ہوگی، وہ اپنے مطلب میں مشغول ہوجاتے ہوں گے اور قلم کو حرکت دے کر اپنے اندر طمانیت وانبساط محسوس کرتے ہوں گے۔

ان کی کالم نگاری کی خوبیوں کا علم تو ان کے کالموں کے پانچوں مجموعوں کے مطالعے کے بعد ہوتا ہے، اب تک جنھوں نے اس کی قراءت کی ہے اور اپنا تاثر ظاہر کیا ہے، ہم یہاں ان میں سے صرف ایک تاثر نقل کررہے ہیں: ڈاکٹر معز کی کتاب "وہاں کی

بات'' میں واحد نظام آبادی نے ان کی کالم نگاری سے متعلق بڑے پتے کی بات تحریر کی ہے'' عابد معز کے تحریر کردہ کالموں میں لفظیات، تعبیرات، محاورات، تراکیب، تشبیہات واستعارات، جامعیت، ربط، تسلسل اور موزوں طرز نگارش جیسی خوبیاں ملتی ہیں، ان میں موقع ومحل کے اعتبار سے بات سے بات پیدا ہوتی ہے اور درمیان میں حالات، واقعات اور مختلف مسائل کا کچھ اس انداز میں بیان ملتا ہے کہ جس سے قاری کو وہ باندھے رہتے ہیں، وہ آخر آخر کے فقرے اور جملے میں ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو ضرور بالضرور قاری کو اصلاحی نقطۂ نظر کے ساتھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے''۔

عابد صاحب کے پانچوں مجموعوں کے نام کے آخر میں ''بات'' کی ردیف ہے، جس طرح فکر تونسوی نے اپنا فکاہیہ کالم'' پیاز کے چھلکے'' رکھا تھا، اور ہر چھلکے کے نیچے ایک چھلکا ردیف کی صورت میں نمودار ہوتا تھا، اسی طرح عابد صاحب نے چھلکے پر چھلکے کی طرح سے بات سے بات پیدا کی ہے اور ہر ہر بات سے کوئی نہ کوئی اصلاحی نکتہ اخذ کیا ہے، حالاں کہ کام سے کام بنتا ہے، مگر ڈاکٹر معز صاحب نے بات سے بات بنانے کی ہمت کی ہے، اور ہر بات؛ اگر چہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بے سلیقہ تھی مگر معز صاحب نے عابدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اسے اتنے سلیقے سے پیش کردی ہے کہ وہی بے سلیقہ بات ''باعث عزت'' بن گئی، اور بگڑتا کام بن گیا۔

ہر ہفتہ کسی مؤقر اخبار کے لیے کوئی نئی بات لکھنا؛ جس میں کوئی پتے کی بات کہی گئی ہو، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی، ہر باتونی شخص سے یہ کام نہیں ہوسکتا، کیوں کہ ایسے دیار میں جہاں سیاست کو موضوع بنا کر کسی سیاسی شخصیت پر کچھ طنز و تعریض کے فقرے کس دیے جائیں، کسی لیڈر کی ہنسی اڑادی جائے، بلکہ دوسرے ممالک کے سربراہ پر انگلی اٹھادی جائے، ایک ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ ہندوستان کے اخبارات میں عموماً فکاہیہ کالم لکھنے والے حضرات انھی موضوعات کو اختیار کرتے ہیں جو گذشتہ ہفتہ میں موضوع کے اعتبار سے گرم رہا ہو، پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے اتنے کثیر فکاہیہ مضامین لکھے، مگر ان میں کسی ایسی شخصیت کو نشانہ نہیں بنایا گیا جن کو ہدف ملامت بنانے سے قلم کار کو جیل کی ہوا کھانی پڑے، یا کم از کم حکومت وکسی شخصیت کی نگاہ میں معتوب ہونا پڑے۔ اس لیے انھوں نے عام قسم کے مضامین جیسے خود اپنی ذات کو نشانہ بنانا، بیوی بیگم کے نخرے، نوکر، صحت، طب، فلم، درس وتدریس، تعلیم، حیوانات، سبزیاں، بڑھتی ہوئی آبادی، جدید نسل کی بے چہرگی، فون، موبائل، بھوک اور مٹاپا، ریال، عقد، قرض، صحرا، اور پٹرول جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اور ہر موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''پھر چھڑی بات'' کتاب کے ایک مضمون ''میں ہر آنسو پونچھوں گا'' سے ایک اقتباس پیش کرکے بات ختم کرتا ہوں۔

''بیمار پڑتے ہیں تو دواخانہ جانے سے پہلے کئی مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ علاج پر اٹھنے والے خرچ کے خیال سے بیماری میں اضافہ ہوجاتا ہے، مجبور ہوکر دواخانہ جاتے ہیں تو جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے، تکلیف سے کم اور بل کے بوجھ سے زیادہ آنسو بہ نکلتے ہیں، آنسو نکل پڑنا معمولی بات ہے، بعض مریض بل دیکھ کر مزید بیمار ہوجاتے ہیں، شاید اسی لیے ایک تجربہ کار مریض نے نرسنگ ہوم کی انتظامیہ کو مشورہ دیا تھا کہ بل سیکشن کے پاس بھی ایک ایمرجنسی روم رکھنا چاہیے تاکہ بل سے لگنے والے صدمہ کا فوری علاج کیا جاسکے''۔ ص ۹۶۔

اب اگر چہ ڈاکٹر صاحب نے لکھنا بند کردیا ہے، البتہ جو کالمز ابھی موجود ہیں اور کتابی شکل میں سامنے نہیں آئے ہیں ان کی ترتیب دے رہے ہیں، اگر ایسا ہے تو پھر نام کے اعتبار سے شاید وہ ''آخری بات'' ہو۔

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔لیکچرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نئے سال کا سورج نئی صبح وامنگ کے ساتھ طلوع کیا جائے!!

سال 2020 اپنے تلخ تجربات کے ساتھ گزرنے کو تو گزر گیا، مگر اس کی تلخ یادیں بدستور ہماری آنکھوں کے سامنے اور مظلوموں کے دلوں میں قائم ودائم ہیں، دراصل جسم اور بدن کا زخم چند دنوں میں مندمل ہوجاتا ہے اور تھوڑے بہت علاج ومعالجے کے بعد انسان مکمل شفایاب ہوجاتا ہے، مگر زبان کا زخم، ظلم وزیادتی کا اثر اور نفرت وعداوت کی سیاست کا گھاؤ چاہ کر بھی مندمل نہیں ہوپاتا! کیونکہ سچے اور ہمدرد انسانوں کی پہچان ہی ان کی زبان سے نکلی ہوئی دو میٹھے بول اور دل سے ابھرتے ہوئے دردمند جذبات واحساسات سے ہوتی ہے، زمانہ جاہلیت کے کسی مشہور شاعر کا بہترین شعر ہے. لسان الفتی نصف و نصف فؤادہ ... ولم یبق الا صورۃ اللحم والدم. یعنی انسانی شخصیت میں آدھی چیز اس کی زبان ہوتی ہے، جس سے وہ نفرت وعداوت یا محبت والفت کا اظہار کرتا ہے اور ماحول کو سازگار یا زہر آلود بناتا ہے اور نصف حصہ اس کا دل ہوتا ہے، جس سے وہ اپنی تعمیری یا تخریبی افکار وخیالات کا بیج بوتا ہے، اس کے بعد گوشت پوست اور خون کے سوا انسان میں اور کیا باقی بچتا ہے؟

افسوس کہ یہ دور جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں اور بالخصوص 2020 کا سال جس کا ابھی ابھی اختتام پذیر ہوا، مگر اس سے بے شمار تلخ تجربات اور تباہ کن مشاہدات جڑ گئے ہیں، جن کے بارے میں سوچ کر اور سن کر زندہ دل انسانوں کا ضمیر چیخ اٹھتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ مردہ ضمیر انسانوں کی بستی میں آباد ہوگئے ہیں، جہاں نہ انسانیت کی قدر ہے اور نہ اس کی خیرخواہی کی فکر۔۔ہم اپنی تمام تر ترقیات اور ایجادات کے بلند بانگ دعووں کے باوجود بھی دل وزبان اور انسانیت کی خیرخواہی و بھلائی والے اوصاف وصفات سے عاری ہوتے جارہے ہیں۔ انسانوں کی جان سے زیادہ جانوروں کو فضیلت دی جارہی ہے، نعوذ باللہ جہاں گائے کو ماتا اور معبود، اس کے گوبر کو بدن پر لگانے اور اس کے ناپاک پیشاب کو پینے پر کورونا وبا سے چھٹکارا کا نسخہ بتارہے ہیں؟! زمانہ جاہلیت اور ہمارے دور کی جہالت میں کیا فرق باقی بچ گیا ہے؟! بلکہ ہم تو 2020 میں زبان ودل کے اعتبار سے ان جانوروں کے اوصاف سے بدتر نظر آئے ہیں، جو اپنے مالک کی وفاداری میں اپنی مثال آپ رکھتے ہیں؟! گائے کے گوشت کے بہانے اور شک کی بنیاد پر کتنے بے قصور لوگوں کو شرپسند عناصر نے جان سے مار دیا ہے، ہجومی حملوں میں کتنے مسلمانوں کو شہید کردیا گیا ہے، ملک ہندوستان کے مشہور صوبہ کیرلا میں ایک ہتھنی کی موت کو لے کر ہندو مسلم پر کیا کیا سیاسی ڈرامہ ہوا، یوپی کی یوگی سرکار نے تو ظلم وزیادتی کی انتہا کردی ہے کہ اس کے دور اقتدار میں کتنی بے قصور جانوں کا نقصان ہوا حتی کہ معقول کھانے پینے کی اشیاء پر بھی پابندیاں عائد کردی گئیں، لوگ چاہ کر بھی اپنی پسند کی غذا نہیں کھاسکے، لو جہاد پر متنازعہ قانون بنالیا گیا، اس کی گھسی پٹی سیاست سے عوام وخواص تا حال اپنی پریشانی کا اظہار کررہے ہیں، بیس کی ٹیس، اس کی تباہ متعدد کاریاں وبربادیاں اور سارے زخم ابھی بھی ہمارے دلوں میں تازہ اور ہرے ہیں۔ملک کی معیشت اور تعلیم وتربیت کے نظام کو کس غار میں دھکیل دیا گیا ہے، جسکی تلافی فی الحال ناممکن اور محال بن گئی ہے،

کاش 2021 کا نیا سال اور اس کا سورج ہماری سوچ وفکر اور زبان وادب میں نمایاں تبدیلی کا سال ثابت ہو، زخموں پر مرہم پٹیوں، امراض واسقام سے ہماری مکمل نجات کے ایام ثابت ہوں، کاش! نئے سال کی آمد کے موقع پر حکومت اپنی پالیسیوں کو مظالم سے پاک، فتنوں سے صاف اور سازشوں سے دور تیار کرکے ایک ایسا نظام نافذ کرے جو ہم سبھوں بالخصوص ہندو مسلم کیلئے امن وسلامتی کا داعی، اتحاد واتفاق کا پیکر، یکجہتی و یگانگت کا جامع اور مودت واخوت کا حامل ہو، ہم سب ایک دوسرے کو محبت کی نگاہوں سے دیکھنے والے اور دعائیں دینے والے ہوں، نئے سال کا سفر پوری انسانیت کیلئے نئی صبح وشام، نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کا پیکر ہو، اور ہم اس شعر کو گنگناتے ہوئے ایک دوسرے کو استقبال کرنے والے بنیں، نئی زندگی کی شروعات کرنے والے بنیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سال 2020 کی ہولناکیوں سے کون شخص ہے جو واقف نہیں ہے؟ اندھا بینا بھی اس کے کسک اور ٹیس کو محسوس کررہا ہے، جس کی شدید چوٹ اور زخم سے پورا ملک متاثر ہے، اس کی معیشت تباہ و برباد ہوکر رہ گئی ہے، عوام وخواص برے حال میں ہیں، فرقہ پرستوں کی بداعمالیوں اور حکمراں طبقے کی بعض غلط پالیسیوں کے نتیجے میں پورا ملک بدحال ہوکر رہ گیا ہے، اس لیے اگر اسے فتنوں اور آزمائشوں کا سال کہا جائے تو بالکل بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ ارباب اقتدار کی اوچھی سیاستوں اور فرقہ پرستوں کی بعض نحوستوں اور ظلم وزیادتی کی بے برکتی سے عوام کی پریشانیوں میں حد درجہ جو اضافہ ہوا ہے، اس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی ہے، اس لئے اس کو مودی -شاہ کی ملی بھگت والا تباہ کن سال کہنا زیادہ مناسب اور موزوں ہوگا۔

حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے شرپسند عناصر نے بھرپور فائدہ اٹھایا، مظلوموں پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑا، کمزوروں کا جتنا جانی اور مالی نقصان کیا، اللہ کو ہی معلوم ہے، اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کی جو آگ بھڑکائی، جس سے پورے ملک کی خوشگوار فضا متاثر ہوگئی، ایوان پارلیمنٹ میں کالے قوانین کو متعارف کرایا گیا اور اس طرح ملک کے دستور پر حملہ اور اس پر حلف سے کھلواڑ کیا گیا اور ہندوستان کے آئین میں ترمیم کے ذریعے جس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے، وہ جمہوریت کے تانے بانے کو بکھیرنے کی ناپاک کوشش ہے، ہندو راشٹرہ بنانے کی سازش ہے، اس کے لیے ہندو مسلم منافرت کا جو بیج بویا گیا، ناپاک پروپیگنڈے کیے گئے، گندی سازشوں کا جال پھیلایا گیا، نفرت وعداوت کا دیوار کھڑا کیا گیا، اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا گیا، جس سے کتنے بے قصور مسلمانوں کا ناجائز خون بہا، اور آج بھی مسلمانوں کو ٹارگٹ بنایا جارہا ہے، ان کے خلاف ججوں کو خریدا جارہا ہے، عدالتوں کو رسوا کیا جارہا ہے اور انہیں غلط فیصلے سنانے پر مجبور کیا جارہا ہے، دن دہاڑے دھاندلی کی جارہی ہے، حق کو ناحق، مسجد کو مندر بتایا جارہا ہے، حق پرستوں کے خلاف مقدمات درج کیے جارہے ہیں، سچ بولنے والوں کے منہ پر تالا لگایا جارہا ہے، طاقتوروں نے کمزوروں کے حقوق کو دبانے کی ہر ممکن کوشش شروع کردی ہے، بلکہ انسانی حقوق کی کھلے عام پامالیاں ہورہی ہیں، آزادئ رائے پر شکنجہ کسا جارہا ہے، شریعت سے چھیڑ خوانی ہورہی ہے، حتی کہ طلاق کے فیصلے میں حکومت نے جس ہٹ دھرمی سے کام لیا ہے وہ بالکل نامناسب ہے، یہاں تو مدارس ومساجد کے احترام کو نیلام کیا جارہا ہے، کورونا وبا کا الزام تبلیغی جماعت والوں پر لگا کر دعوت وتبلیغ کے نظام پر تلوار لٹکائی جارہی ہے، فی الحال مدارس ومکاتب بند کردیے گئے ہیں، دیر وحرم کو مقفل کردیا

گیا ہے، تعلیم وتربیت کے کارخانے کو کھوکھلا بنانے کی پلاننگ ہورہی ہے، شراب کی دکانوں کو رہنمائی فراہم کی جارہی ہے، مگر تعلیمی ادارے بدستور بند پڑے ہیں۔ حکمرانوں کے عجیب و غریب فیصلوں اور پالیسیوں سے عوام کا اعتماد بالکل اٹھ گیا ہے، لاک ڈاؤن کے عرصے میں بھی رحم وکرم کے بجائے انسانوں پر ظلم وستم ڈھایا گیا ہے، آرٹیکل 370 پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے، کشمیریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں، شرپسندوں کو کھلی چھوٹ فراہم کی گئی ہے۔ اور آج بھی یہاں حالات جوں کا توں بلکہ بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ **اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا و الآخرہ.**

یہ سب کام بی جے پی سرکار بالخصوص سن 2020 میں مودی-شاہ کی ناک کے نیچے بلکہ ان کی سرپرستی میں انجام دیئے گئے، ہنوز مظلوموں کے جان ومال سے ہولیاں کھیلی جارہی ہیں، ان کے کاروبار کو تہس نہس کیا جارہا ہے، ستم بالائے ستم یہ کہ مظلوم کو ظالم کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اور ظالموں کی پیٹھ کو تھپتھپا کر ان کو بڑھاوا دیا جارہا ہے، کئی فساد وجھڑپ میں پولیس کو ناجائز اختیار دیا گیا حتی کہ انہوں نے طلبا وطالبات پر بے جا ظلم کئے، ڈنڈے برسائے، کسی کا سر، کسی کا پیر تو کسی کی آنکھیں پھوڑ دیں، کیسے کیسے ظلم وستم ہیں جو بے جا ڈھائے گئے ہیں! کیسی کیسی سازشیں ہیں جو جان بوجھ کر رچی گئی ہیں! حتی کہ شیطانوں کو بھی ظالموں نے پیچھے چھوڑ دیا، حکمرانوں کی بے حسی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ ان کے کانوں پر جوئیں تک نہیں رینگیں اور مظلوموں پر ظلم وستم کا سلسلہ بند ہونے کے بجائے روز بروز دراز ہوتا چلا گیا، آخر ظلم کو روکنے یا دو فریقوں میں صلح کرانے کی ذمہ داریاں اعلی وزراء کی نہیں بنتی ہے؟ اسی لیے خدائے واحد نے پوری دنیا بشمول ملک ہندوستان کو آزمائشوں اور مصیبتوں میں گرفتار کردیا اور وہی ہمیں نجات دینے والا بھی ہے۔

سال 2020 میں مودی حکومت کی غلط پالیسیوں اور حکمرانوں کی نحوستوں نے ملک کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، شرپسندوں کی ظلم وزیادتی خود ان کے لئے سبق آموز بن گئی۔ ان کی وجہ سے ملک کو مختلف بیماریوں اور آفتوں بالخصوص کرونا وائرس نے آدبوچا، لاک ڈاؤن کیوجہ سے اچھے اچھوں کی حالت تباہ ہوکر رہ گئی، کاروبار ٹھپ ہوکر رہ گئے، ملک کی معیشت تباہ و برباد ہوگئی، ملک قرضوں میں ڈوبتا چلا گیا، مظلوموں کی آہ وبکا نے ساری دنیا کو بڑی آزمائشوں میں گرفتار کردیا، خدا نے ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کرنے والوں کو بھی پکڑ لیا، کتنے بڑے بڑے لوگ اس مرض میں ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سوگئے، لاکھوں انسانوں کا جانی ومالی نقصان ہوگیا، کیونکہ جب خدا کا عقاب وقہر اترتا ہے تو وہ کسی اچھے برے کی تمیز نہیں کرتا ہے، وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، سچ یہی ہے کہ خدا کا قانون ہی ہمیشہ غالب رہنے والا ہے، ظلم وزیادتی اور نفرت وعداوت کو خدا کو سخت ناپسند کرتا ہے، ظلم وزیادتی کیساتھ کبھی کوئی حکومت تادیر باقی نہیں بچ سکتی! آج مودی-شاہ حکمراں ہیں، کل کسی اور کو خدا موقع دے گا، جو خود اچھے ہونگے اور عوام وخواص کیساتھ بھی اچھا معاملہ وبرتاؤ کرینگے۔ اور اللہ اسکا بھی بھلا کریگا۔

اب تو موجودہ حکومت اور ارباب اقتدار کو ہوش کے ناخن لینا چاہیے، کیونکہ لاک ڈاؤن کسی مرض کی دوا نہیں ہے، اصل دوا تو گناہوں سے اجتناب، غرور وتکبر سے گریز، ظلم و زیادتی سے پرہیز ہے، دوائی کا ایجاد تو ایک انسانی تخلیق ہے، مرض اور شفا دونوں کا مالک تو اللہ ہے جو ہمارا بھی خالق ہے اور تمام مرض کا شافی بھی، مرض بھی اسی کی مخلوق ہے اور شفا کا بھی وہی مالک ہے، مودی جی کے اس بیان سے کہ "2020 صحت کے چیلنجوں کا سال تھا، 2021 صحت کا حل نکالنے کا سال ہوگا" کچھ بھی ہونے والا نہیں ہے، جب تک انسان اپنے

ناراض رب کو راضی نہ کرلیں یا اس بات پر آمادہ نہ ہو جائیں! ظلم وستم سے بالکل باز نہ آجائیں! عدل وانصاف کو اپنا مزاج نہ بنالیں! اپنے ماضی کا احتساب اور مستقبل کو نصیحت وعبرت تصور نہ کرنے لگیں! اس وقت تک انسان ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں گرفتار ہوتا رہے گا۔

ہر طرح کا ظلم وزیادتی یقیناً مرض اور بڑا گناہ ہے، جس کا علاج ومعالجہ جسمانی بیماریوں سے قبل ہونا ضروری ہے، ہمیں اس کے لیے توبہ واستغفار کی کثرت کرنی چاہئے، کیونکہ پوری دنیا اللہ کی مخلوق ہے، بلکہ اس کا ایک کنبہ ہے، سب کو ایک خدا کی پرستش کرنی چاہئے اور سارے انسانوں کو ایک سمجھتے ہوئے سب کا سمان کرنا چاہیے، ورنہ ہمارے جرائم ومظالم کہیں پوری انسانیت کی تباہی و بربادی کا ذریعہ نہ بن جائے اور قیامت میں سوائے پچھتاوے کے ہمیں کچھ اور ہاتھ نہ آجائے، اس سے قبل ہمیں اپنے گریبان کو جھانکنا چاہیے اور اپنی جفاؤں سے توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اپنے خالق ورازق کا بھرپور خیال کرنا چاہیے تاکہ سال 2021 میں اللہ ہمیں ہزاروں آفتوں بشمول کورونا وائرس اور دیگر عذاب وعقاب سے کلی طور پر نجات عطا فرمائے، ہمارے لئے سال نو کی سب سے بڑی مبارکبادی اور خوشخبری یہی ہوگی کہ اس کی صبح ہمارے لیے نوید ثابت ہو، باہمی محبت پیدا کرنے کا سال ثابت ہو، اس کے لیے ہمارے پاس جو کچھ بھی سبیل بن سکے اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھانا چاہیے اور ناراض خدا کو راضی کرنے کی ہر ممکن فکر کرنی چاہئے۔ اللہ ہمیں آفتوں سے چھٹکارا دے، ظلم وزیادتی سے پورے ملک کو پاک کردے اور نئے سال کے سورج کو ہمارے لیے نئی صبح وامنگ کیساتھ طلوع فرمادے!!

نہ توبہ کی جفاؤں سے نہ خالق کا خیال آیا
ہزاروں آفتیں لے کر کورونا کا وبال آیا!!

نیاز جیراجپوری

جمہوریت کی لاش

عداوت، بغض ونفرت کی جو آندھی رُک نہیں پاتی
اُسی آندھی نے خاک وخوں کی منظر دِکھائے ہیں
گلی کوچوں میں بہتا خون، زخمی لوگ اور لاشیں
اُسی آندھی نے یہ سب اور جلتے گھر دِکھائے ہیں

کہیں فرقہ پرستوں نے کیا ہے قتل لوگوں کو
کہیں زندہ جلا ڈالا اُنہیں نے بے گناہوں کو
کہیں معصوم بچے ہو گئے زخمی کہیں چھلنی
یقیناً موت تڑپی ہوگی سُن کر اُنکی آہوں کو

کِسی کی مانگ اُجڑی ہے، کِسی کی گود اُجڑی ہے
کوئی سارا اثاثہ زندگی کا کھو کے بیٹھا ہے
کِسی کے چہرے پر پتھرائی آنکھوں سے یہ ظاہر ہے
کہ یہ سارا اُجالا زندگی کا کھو کے بیٹھا ہے

تقاضا وقت اور حالات کا ہے جو اُسے سمجھو
سُنو! اے پیار سے پیارے وطن والو چلو آؤ
نہ بیٹھو مُوند کر آنکھوں کو، دیکھو اور بڑھو آگے
مُحافِظ دیش اور قانون کے بنتے چلے جاؤ

کِیا زرخیز جس دھرتی کو خوں دے کر شہیدوں نے
اسے کچھ ذہن و دِل کے کالوں نے بنجر بنا ڈالا
وطن اپنا مِثالی تھا کبھی جو سارے عالم میں
اسے کچھ سر پھِروں نے بد سے بھی بدتر بنا ڈالا

ہر اِک چوراہے پر جمہوریت کی لاش لٹکی ہے
درِ اِنصاف پر قانون کا پُتلا مُسلّط ہے
جہاں سب ہنستے گاتے تھے، جہاں تھیں رَونقیں کل تک
نیازؔ آج ان گلی کوچوں میں سناٹا مُسلّط ہے

ڈاکٹر صالحہ صدیقی (الٰہ آباد)

اردو سفرنامے کی تاریخ میں خواتین ہند کی خدمات

حالات سفر پر مشتمل زبانی بیان سفر گوئی (TRAVELLOGUE) کہلاتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے حالات سفر لکھ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے تو یہ تحریر ادبی زبان میں سفرنامہ یا سیاحت نامہ کہلاتی ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے ٹراویلاگ کی اصطلاح مروج ہے۔ کبھی کبھی اسے ٹراویلنگ اکاؤنٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ہندی میں یہ "پرواس ورنن" کہلاتا ہے۔ سفرنامہ یا سیاحت نامہ کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ صنف صرف حالات سفر کا سیدھا سادا بیان نہیں بلکہ مقام سفر کے جغرافیائی، طبعی، عصری، تاریخی، سماجی، معاشرتی، معاشی، علمی اور ادبی حالات وکوائف کا آئینہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ یا سیاحت نامہ کی عصری تاریخی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی اہمیت مسلّم ہے۔ اس صنف میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی طبع آزمائی کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرف اہل علم و دانشوروں نے اس طرح توجہ نہیں کیں جس کی یہ مستحق تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین کی غیر نثری اصناف میں کی گئی خدمات میں تحقیق وتنقید کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے بہرحال اس مضمون میں سفرناموں میں کی گئی خواتین کی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا اور ہم خواتین کو پیش بھی کیا جائے گا۔ آزادی سے قبل خواتین سفرنامہ لکھنے والیوں میں اردو کے ابتدائی خواتین سفرناموں کے نمونے میں چند اہم نام دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں مندرجہ ذیل خواتین کا نام اہم ہیں۔

نواب سکندر جہاں والئی بھوپال کا تحریر کردہ سفرنامہ حج، تاریخ وقائع حج ہے، جو ان کے ۱۸۶۱ء کے حج کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ مخطوطہ کی شکل میں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد کوئی خاص نمونہ دیکھنے کو نہیں ملتا، اس کے بعد خواتین کے سفر نامے بیسویں صدی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

صغریٰ ہمایوں مرزا حیا حیدرآباد کی مشہور شاعرہ وادیبہ اور مصلح نسواں کے ۸ سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ وہ ۳۰، دسمبر ۱۸۸۳ء کو پیدا ہوئیں تھیں۔ وہ زندگی بھر تصنیف تالیف کے کاموں میں مشغول رہیں۔ ان کا ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنے شریک حیات کے ساتھ اندرون ملک و بیرونی ممالک کے سفر کئے اور باقاعدگی کے ساتھ حالات سفر تحریر کئے۔ ۱۹۰۲ء میں عراق کا سفرنامہ، ۱۹۰۸ء میں بھوپال، دہلی، آگرہ کا سفرنامہ، بعنوان روزنامچہ ۱۹۱۰ء میں سیر بنگال و بہار ۱۹۱۲ء میں سیاحت جنوبی ہند ۱۹۲۴ء میں سیاحت یورپ ۲ جلدوں میں اور ۱۹۲۸ء میں سفرنامہ کشمیر شائع ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۰۸ء میں نواب آف جنجیرہ (قبل آزادی بمبئی کے نزدیک ایک جزیرہ پر واقع مسلم ریاست) کا سفر کیا۔ جسے انھوں نے رقم کیا۔

بیگم رفیعہ سلطانہ نازلی بیگم نے اپنا سفر یورپ کا سیاحت نامہ، سیر یورپ شائع کیا جو ان کے ان خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط انہوں نے سیر یورپ کے دوران اپنے اعزا واقربا کو لکھے تھے۔

عطیہ فیضی نے یورپ میں تعلیم کے زمانے میں (۱۹۰۶ء) جو خطوط اپنی بہن زہرہ بیگم فیضی کو لکھے تھے۔ ان کو مرتب کر کے ان کا ایک سفرنامہ، زمانہ تحصیل کے عنوان سے مفید عام پریس آگرہ نے ۱۹۲۲ء سے شائع کیا گیا تھا۔ اس طرح ان کے سفر بھوپال ۱۹۰۸ء پر مشتمل ایک سفرنامہ ان کی بہن زہرہ بیگم فیضی نے ۱۹۱۰ء میں ایک رسالے میں شائع کیا تھا۔ اسے ہم زہرا بیگم فیضی کا تحریر کردہ سفرنامہ کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بھی ان کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ اس طرح گویا تینوں فیضی بہنیں سفرنامہ میں دلچسپی رکھتی تھیں۔

اسی طرح چند سفرنامے اور بھی دستیاب ہوتے ہیں جن میں ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے شاہی خاندان، بیگمات بھوپال سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون شاہ بانو نے سفرنامہ لکھا۔ یہ نواب سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال کے ہمراہ کرنل مجید اللہ خاں کے علاج کی غرض سے یورپ گئی تھی

اورلندن میں سات ماہ قیام کیا تھا۔یہ سفر نامہ ۱۹۱۵ء میں سیاحت سلطانی کے عنوان سے شائع ہوا۔اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں مولانا حسرت موہانی کی اہلیہ بیگم نشاۃ النساء کا سفر نامہ حجاز وعراق شائع ہوا جو انہوں نے ۱۹۳۶-۱۹۳۵ء میں کیا تھا،یہ ان کے بیٹی کے نام لکھے خطوط پر مشتمل ہیں۔اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے رئیس حمید اللہ خاں سربلند جنگ کی بیگم نے اپنے یورپ کے حالات وکوائف ''دنیا عورت کی نظر میں'' کے عنوان سے شائع کیا۔آزادی کے بعد اردو میں خواتین کے سفر ناموں میں جو نام سامنے آتا ہے ان میں اہم نام میں شامل ہیں جنھوں نے بہترین سفر نامے لکھے،جن میں شامل ہیں:

آصفہ مجیب کا نام آزادی کے بعد لکھنے والی خواتین میں سر فہرست ہیں۔''ماضی کے جھروکے سے'' کے عنوان سے ان کا سفر نامہ (رسالہ آج کل،دہلی،جنوری ۱۹۸۴ء۔ص ۳۶-۴۱) شائع ہوا۔پروفیسر محمد مجیب مرحوم (شیخ الجامعہ،جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی شریک حیات بیگم آصفہ مجیب اردو کی اچھی ادیبہ،افسانہ نویس گزری ہیں ان کا افسانوی مجموعہ پرند اور دوسرے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے اپنی سیاحت کشمیر کے حالات پر مبنی ایک چھوٹا سا سفر نامہ تحریر کیا۔اگر چہ یہ ایک چھوٹا سا سفر نامہ ہے لیکن یہ دلکش زبان واسلوب میں دلچسپ سفر نامہ ہے۔

اُم ہانی اشرف (رخسانہ نکہت لاری) آزادی کے بعد خواتین سفر نامہ لکھنے والیوں میں ان کا نام بھی اہم ہے۔انھوں نے ''تجلیات حرمین'' کے عنوان سے سفر نامہ لکھا جو ادارہ رفیق،عظیم آباد کالونی،پٹنہ۔۱۹۸۷ء سے شائع ہوا۔مشہور ادیب جناب مقبول احمد لاری کی صاحب زادی ڈاکٹر ام ہانی اشرف بھی اچھی شاعرہ اور ادیبہ تھی ان کا مجموعہ کلام نالۂ نیم شب شائع ہو چکا ہے۔انہوں نے جب سعادت حج وزیارت حرمین شریفین حاصل کی تو اپنے حج کے حالات سفر وتاثرات کو تجلیات حرمین نامی کتاب کی صورت میں پیش کیا۔یہ بنیادی طور پر سفر نامہ حج ہے۔انہوں نے اپنے سفر نامہ کا آغاز ایک منظوم انتساب سے کیا ہے جو جناب مقبول احمد لاری کے نام ہے۔چونکہ مصنفہ شاعرہ تھی۔اسی لیے انھوں نے اپنے جذبات قلبی کا اظہار نعتوں اور سلاموں میں پیش کیا ہے ان کا انتخاب بھی اس سفر نامے میں شامل ہے۔

اے۔امیر النساء اسی طرح ایک اور اہم نام خواتین سفر ناموں میں ان کا بھی ہے ان کا سفر نامہ بعنوان ''ارض مقدس میں چند روز'' جو (انشاء پبلی کیشنز،کلکتہ۔۲۰۰۲ء) سے شائع ہوا۔اے امیر انساء بیگم نے مغربی ایشیا کے ممالک اور مقامات مقدسہ کی سیاحت کے بعد اپنے سفر نامہ ارض مقدسہ میں چند روز کے عنوان سے لکھا ہے۔اس کا پیش لفظ مشہور جریدے انشاء کلکتہ کے مدیر جناب ف س اعجاز نے لکھا ہے جنہوں نے خود بھی سفر نامہ نگاری کی ہے اور اس صنف کے فن نگارش سے بخوبی واقف ہیں۔اے امیر انساء بیگم نے بغداد،کوفہ،بابل،نجف اشرف،اردن،اسرائیل،بیت المقدس،عمان،قاہرہ،مدینہ منورہ،مکہ معظمہ وغیرہ مقامات کی سیر کی،آثار قدیمہ اور قابل ذکر و قابل دید مقامات کا معائنہ کر کے حالات معلوم کر کے پھر حالات واقعات،معلومات وتاثرات کو دلچسپ زبان واسلوب میں تحریر کیا۔

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کا نام بھی خواتین سفر نامے لکھنے والیوں میں اہم ہے جن کا تعلق گورکھپور سے ہے۔انہوں نے ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں ایک مقالہ اردو کے غیر مذہبی سفر نامے لکھ کر ۱۹۹۹ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔انہیں اس صنف سے کافی واقفیت ہے۔انہوں نے کوئی سفر نامہ لکھا یا نہیں اندازہ نہیں۔اردو سفر نامہ نگاری میں ان کا تحقیقی مقالہ کافی وقیع واہم ہے۔(بیسویں صدی کے بعد ان کے ایک دو سفر نامے شائع ہوئے)۔

بیگم سر بلندجنگ سفر نامہ لکھنے والی خواتین کی کڑی میں اہم نام ان کا بھی شامل ہے۔ان کا سفر نامہ ''دنیا عورت کی نظر میں'' انتہائی اہم ہے۔حیدرآباد کے رئیس حمید اللہ خاں سر بلند جنگ اپنے دور کی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔انہوں نے کئی یورپی ممالک کے سفر کئے اور اپنا ایک سفر نامہ بھی تحریر کیا تھا۔جس میں انہوں نے ہم وطنوں کو غیر ممالک کی ترقی کے قصے سنا کر تشویق دلائی تھی کہ وہ بھی ایسی ہی ترقی کریں۔ان کے سفر میں ان کی بیگم صاحبہ بھی ہمراہ تھیں۔وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ مختلف یورپی ممالک کے سفر کئے وہاں کے حالات وکوائف دیکھے اور اپنے شوہر کے نقطۂ نظر کے عین مطابق اپنا ایک سفر نامہ بعنوان دنیا عورت کی نظر میں تحریر کیا تھا۔اس کے نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں،کتب خانہ آصفیہ وسالار جنگ میں ہیں۔یہ زیادہ مشہور

نہ ہوسکا۔اس میں موصوفہ نے زیادہ تفصیلات سے کام نہیں لیا۔انہوں نے یورپی ممالک کے حالات کو ایک مشرقی عورت کی نظر سے دیکھا۔

بیگم سید یٰسین علی کا سفرنامہ آسٹریلیا کی جھلک (حیدرآباد۔۱۹۵۵ء) ہے۔یہ لوگ حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔انہوں نے اپنی بیگم کے ہمراہ، انگلستان، فرانس، سوئیزرلینڈ اور عراق وغیرہ کے سفر کئے تھے۔ان کی بیگم صاحبہ نے آسٹریلیا کا سفر بھی کیا تھا۔اور اس سرزمین کے حالات وکوائف سفرنامہ میں لکھے تھے۔ یہ حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔مصنفہ کوئی ادبی شخصیت نہیں لیکن ان کی دلکش زبان وانوکھا اسلوب بیان انہیں ایک اچھی رہبر قلم ثابت کرتا ہے۔اس سفرنامہ کے مطالعے سے مصنفہ کی وسعت نظر اور عمیق معلومات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔بیگم سید یٰسین علی آسٹریلیا کے مختلف شہروں علاقوں میں گئیں وہاں کے حالات وکوائف دیکھے اور ان کا ذکر رنگین وشوخ بیانی کے ساتھ کیا۔یہ سفرنامہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔(مخزونہ۔کتب خانہ۔آصفیہ وسالار جنگ وغیرہ)۔

بیگم حسرت موہانی مرحومہ (نشاط النساء بیگم) نے بھی سفرنامہ لکھا، یہ سفرنامہ حجاز وعراق (نیا ایڈیشن مشمولہ بیگم حسرت موہانی اور ان کے سفرنامے) حسرت موہانی کی شریک حیات نشاط انساء بیگم کا سفرنامہ حجاز وعراق پہلے شائع ہوچکا تھا۔لیکن چند سال قبل ۱۹۸۱ء میں عتیق صدیقی صاحب نے ایک کتاب بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط مرتب کرکے شائع کی تو اس میں ان کا یہ سفرنامہ بھی شائع کیا۔اس طرح یہ آزادی کے بعد شائع شدہ سفرنامہ بھی بن گیا۔(شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی۔۱۹۸۱ء)۔انہوں نے اپنے حجاز وعراق کے سفر کے حالات تحریر کئے ہیں۔لیکن کسی مضمون یا انشائیہ، بیانیہ مسلسل سفرنامہ کی شکل میں نہیں۔بلکہ اپنی بیٹی نعیمہ کو خطوط کی شکل میں لکھے ہیں۔یہ ان کے سفر حج ۱۹۳۶ء کے دوران لکھے گئے تھے۔ان کے ۱۹۳۷ء میں انتقال کے بعد مولانا حسرت موہانی نے ان کو بطور یادگار، اپنے رسالے اردوئے معلیٰ میں دو قسطوں میں شائع کردیا اور پیش لفظ میں لکھا کہ یہ بیگم صاحبہ کا سفرنامہ ہے۔سفرنامہ حجاز ۱۹۳۵ء کے سفر کا احوال ہے اور سفرنامہ عراق ۱۹۳۶ء کے سفر کا۔اگرچہ ایک چھوٹا سفرنامہ ہے لیکن "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی مثال ہے۔اس کے بارے میں نقادوں نے بڑی اچھی رائے کا اظہار کیا ہے اس کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں حسرت موہانی اور ان کی بیگم کی خانگی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں اور کہیں کہیں ان کے رہن سہن، خورد ونوش کے طریقوں کا بھی علم ہوتا ہے اور کئی بار ان دونوں کی زندگی کے ایسے گوشوں کا علم بھی ہوتا ہے جن پر خوش عقیدگی اور مبالغے کی تہیں جم گئی ہیں۔(ص ۱۱)

ڈاکٹر ثریا حسین: پیرس وپارس (مکتبہ جامعہ، دہلی۔۱۹۶۸ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پروفیسر، ڈاکٹر ثریا حسین کا سفرنامہ پیرس و پارس۔ان کی یورپ اور ایران کے دو اسفار کے حالات پر مشتمل سفرنامہ ہے۔ڈاکٹر ثریا حسین دور حاضر کی جانی پہچانی ادیبہ محقق ونقاد ہیں۔ انہوں نے مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی کی حیات وخدمات پر مقالہ تحریر کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس کے علاوہ وہ ایک عالمانہ کتاب جمالیات شرق وغرب کی مصنفہ بھی ہیں۔اور ایک سفرنامہ پیرس وپارس کی بھی۔ان کے سفرنامہ پر کئی ادباء ونقادوں نے توصیفی اظہار خیال کیا ہے۔ان کا سفر ۱۹۵۷ء میں ہوا تھا۔یہ سفرنامہ مغربی تہذیب ومعاشرت واشیاء وزبان وادب میں ڈوبا ہوا ہے۔لباس رہن سہن، سواریاں، عمارات اشیاء سبھی کچھ انہوں نے کوہ قاف، مساجد، پیٹرولیم کی صنعت، شکر کے کارخانوں، بادام پستہ، سیب انگور کی فراوانی کا ذکر کیا۔شمس الدین تبریزی کا تبریز، قم، اصفہاں، زندہ رود، شیراز، ماژندران کا ذکر کیا پھر وہ انقرہ۔استنبول، ٹرسیٹ (بحر روم کی بندرگاہ) گیں، پھر بغداد، نیشاپور، پھر افغانستان، ہرات، کابل وغیرہ گیں۔۱۹۶۰ء میں انہیں سوبورن یونیورسٹی سے ڈگری ملی، ۱۹۸۲ء میں وہ پھر سوبورن پیرس کی سیر کرتی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کی پروفیسر تھی۔ انہیں ۱۹۶۸ء میں ایرانی حکومت کے ثقافتی ادارے، بنیاد فرہنگ ایران کی دعوت پر انہیں ایران جانے کا موقع ملا اور انہوں نے واپس آکر اپنا سفرنامہ "تاثرات سفر ایران" کے عنوان سے شائع کیا۔اس میں انہوں نے گہرے اور جذباتی احساس کو دلکش انداز میں ایران کے حالات وکوائف بیان کئے ہیں۔

زہرہ بتول سفرنامہ حجاز وایران (اسلامک بک سینٹر، بنگلور۔۲۰۰۹ء) بیگم زہرہ بتول، معروف عالم دین اور دارلسلام عمرآباد (تامل ناڈو) کی

نامور ہستی جناب ابوالبیان حماد کی اہلیہ ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ حجاز و ایران کا سفر کیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت سے قبل ہی انھوں نے اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔ اس سفر نامہ میں ان کی نظمیں مجاہد کا کردار، اسلام کا مجاہد، سوئے حرم اور مناظر مدینہ، بھی درج ہیں۔ یہ سفر انہوں نے جولائی ۲۰۰۸ء میں کیا تھا۔ وہ نہ صرف تہران گئی بلکہ کئی اور شہروں جیسے کرمان، شہر ایران، سرادن، فاش، اربلان، اور شیراز وغیرہ کی بھی سیر کی، شیراز میں شیخ سعدیؒ و حافظؒ کے مزارات کی زیارت کی انہوں نے قصر شاہی اور ایرانی مدارس کی سیر بھی کی۔ سفر نامہ میں ایران کے مشاہد علم و فضل خصوصاً شیخ سعدیؒ، حافظؒ، نظام الملک طوسیؒ، عمر خیامؒ وغیرہ کا ادبی امور کے تعلق سے تذکرے متاثر کن ہیں۔ سفر نامہ میں ایران اور سعودی عرب کے درمیان رویوں کا فکر انگیز بیان بھی شامل ہے۔

سلطانہ آصف فیضی عروس نیل (مکتبہ جامعہ، دہلی۔ ۱۹۶۸ء) سلطانہ آصف فیضیؒ بمبئی کے اسی مشہور فیضی خاندان کی فرد ہیں جس میں نازی بیگم، زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم فیضی اور کئی دوسری نامور ہستیاں گزری ہیں۔ یہ خاندان اپنی سماجی خدمات، علم پروری ہمدردئی انسان و نسواں وغیرہ کے لئے مشہور رہا ہے۔ اسی خاندان کے ایک فرد پروفیسر آصف علی فیضی ایم اے (کینٹب) بار ایٹ لا۔ کی رفیقۂ حیات سلطانہ آصف فیضی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب قلم خاتون ہیں۔ وہ ناول چنار کا پتہ، سیرت نبوی پر پیارے رسول اور ایک سفر نامہ عروس نیل کی اور چند چھوٹی چھوٹی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ سلطانہ آصف فیضیؒ نے اپنے شوہر کے ساتھ اندرونِ ملک اور کئی بیرونی ممالک کے سفر کئے۔ انہیں اپنے شوہر کے ساتھ کئی سال مصر رہنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے وہاں کے حالات کوائف واقعات، زندگی، مناظر وغیرہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا وہاں کے جزو کل، حسن و قبح، کمزوریاں اور توانائیاں غرض ہر پہلوئے زندگی کو دیکھا۔ منظر کو سمجھا اور اپنے تاثرات سفر نامہ عروس نیل میں تحریر کیا۔ یہ چھوٹا سا سفر نامہ جو معلومات سے پر ہے۔ اس کا نام مصر کے مشہور تہوار اور ایک رسم عروس نیل کے نام پر ہے۔ اس سفر نامے کے عنوان کے پیچھے مصنفہ کا مفہوم یہ ہے کہ مصر آج بھی دلہن ہے، لیکن اس کی قسمت کی کشتی بھنور میں ہی ہے۔ مصنفہ نے صرف مصر کے ظاہری حسن اور شہروں کے سامانِ عیش و نشاط اور شان و شوکتِ ظاہری کو دیکھا بلکہ ان فلاحین (مصری کسانوں) اور غریب طبقہ کی زندگی فلاکت و نکبت کو بھی دیکھا جو غلاموں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصر میں جہاں اس زمانے میں ایک طرف عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ شاہ، امراء، تجار، زردار لوگ عیش و عشرت میں نظر رہے تھے وہی دوسری طرف کسان، مزدور، غریب، دیہاتی جانوروں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔

صادقہ ذکی ان کا سفر نامہ "خیموں کے شہر میں" (مکتبہ جامعہ، دہلی۔ ۱۹۹۸ء) ہے۔ پروفیسر صادقہ ذکی دہلی کی رہنے والی ہیں۔ وہ دنیائے ادب کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے سعادت حج و زیارت روضہ نبیؐ کے حصول کے لئے ۱۹۹۷ء میں سفر حجاز مقدس کیا تھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات اس سفر نامہ میں قلمبند کئے ہیں۔ وہ ۲۹، مارچ ۱۹۹۷ء کو ایک گروپ کے ساتھ جدہ پہنچیں۔ اسی شام مکہ پہنچ گئیں۔ ۳، اپریل کو مدینہ گئیں نو روز قیام کیا، ۱۲، اپریل کو پھر مکہ پہنچیں، ۱۸ اپریل تک مناسک حج ادا کئے، ۲۹، اپریل ۱۹۹۷ء کو جدہ گئیں۔ ۳۰، اپریل ۱۹۹۷ء کو دہلی پہنچ گئیں۔ انہوں نے اپنی یاد داشتوں کو دورانِ سفر ہی رقم کرنا شروع کر دیا تھا۔ واپسی اسکی تکمیل کی۔ یہ سفر نامہ ۳، اگست ۱۹۹۷ء سے ۱۲ جنوری ۱۹۹۸ء تک جریدہ قومی آواز میں بطور ضمیمہ شائع ہوتا رہا۔ ایک دو قسطیں ماہ نامہ انشاء کلکتہ کی زینت بھی بنیں۔ مصنفہ نے اسے عنوانات کے ذیل میں نہیں بلکہ مسلسل بیانی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ البتہ اسے مختلف حصوں میں منقسم کیا۔ اس میں اغراض سفر سفر کی ابتدائی تیاریاں کا تذکرہ نہیں اس کا آغاز ایک دم مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہونے کے ذکر سے ہو جاتا ہے۔ لکھتی ہیں۔ "مسافرانِ حج جب مکہ معظمہ کی پہاڑی سرنگوں سے گزر کر حدود منیٰ میں داخل ہوتے ہیں تو اچانک سفید خیموں کا ایک شہر ان کا استقبال کرتا نظر آتا ہے۔" سفر نامہ کچھ ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ ایک دم شروع ہوتا ہے۔ ایک دم ختم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایک دلچسپ سفر نامہ ہے۔

صالحہ عابد حسین کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا سفر نامہ سفر زندگی کے لئے سفر زو ساز (مکتبہ جامعہ، دہلی۔ ۱۹۸۲ء) ہے صالحہ عابد حسین اردو کی مشہور ادیبہ گزری ہیں۔ ان کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا وہ خواجہ حالیؔ کی پرنواسی تھیں۔ خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی، خواجہ غلام السیدین کی بہن، ڈاکٹر عابد حسین کی بیوی تھیں۔ پانی پت

میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر عابد حسین سے شادی ہوئی۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گزاری ۸، جنوری ۱۹۸۸ء کو انتقال کیا۔ انہوں نے کئی ناول، افسانے، ڈرامہ لکھے۔ ان کی خودنوشت، سلسلۂ روز وشب اور سفرنامہ سفر زندگی کے لئے سوز وساز بھی شائع ہوئے۔ صالحہ عابد حسین نے اندرون ملک وبیرون ملک کئی شہروں وعلاقوں ملکوں کے سفر کئے اور ان کے حالات اپنی کتاب سفر زندگی کے لئے سوز وساز میں بیان کئے۔ یہ کسی ایک جگہ کا سفرنامہ نہیں۔ بلکہ مختلف مقامات کے سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے کشمیر، حیدرآباد، بنگلور، پونہ، میسور، مہابلشور وغیرہ کے اندرون ملک سفر کئے۔ آٹھ برس کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ عراق کا سفر کیا۔ ایران کا سفر بھی کیا۔ (وہ شیعہ عقائد رکھتی تھیں۔) ۱۹۶۲ء میں عراق وایران گئیں۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء تا ۱۹۸۱ء کئی بار پاکستان کا بھی سفر کیا۔ لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد کراچی گئیں۔ ۱۹۵۳ء میں اپنے شوہر کے ساتھ دیار مغرب کا سفر کیا۔ انگلستان، پیرس، سوئزرلینڈ، اٹلی، جرمنی، حج وزیارت کے لئے عراق وعرب کا سفر کیا۔ انہوں نے اپنے اسفار کی روداد مختلف ابواب کے تحت بیان کیا ہے۔ ہندوستان جنت نشان میں کشمیر، حیدرآباد، بنگلور، مہابلیشور، بھوپال کے حالات وکوائف مناظر ومعاشرت ہیں۔ قدرتی مناظر، مقامات، عمارات، شہر، معاشرت، رسوم ورواج واشخاص کے حالات دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ صالحہ بیگم کو کشمیر جانے کا بار بار موقع ملا، ان کے بھائی خواجہ غلام السیدین وہاں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ ان کے سات سالہ قیام کے دوران صالحہ بیگم نے تقریباً کشمیر کے تمام اہم مقامات کی سیر کی اور وہاں کے حالات واقعات، مناظر باشندوں، معاشرت ومسائل وغیرہ کا دلکش انداز میں ذکر کیا۔

صغریٰ مہدی کا نام بھی اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا سفرنامہ سیر کر دنیا کی غافل (نئی آواز، جامعہ نگر، دہلی ۱۹۹۴ء) سے شائع ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر صغری مہدی عہد حاضر کی مشہور ادیبہ، ناول نگار، افسانہ نویس، محقق ونقاد وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اندرون ملک اور بیرونی ممالک، پاکستان، انگلستان، لیمبرڈم، پیرس، امریکہ، وغیرہ کے سفر کئے اور اپنے سفر کے حالات چھوٹے چھوٹے سفرناموں کی شکل میں لکھے۔ ان کا مجموعہ سیر کی دنیا کر غافل کے عنوان سے شائع ہوا۔ سیر کر دنیا کی غافل میں صغری مہدی نے اپنے انگلستان کے سفر کے احوال کو بیان کیا ہے۔ ان کا یہ سفر ان کے کزن انور عباس ملازم ایئر انڈیا کی بہن کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ہوائی جہاز سے لندن پہنچیں۔ مختلف مقامات کی سیر کی اور نئے لوگوں جیسے ڈیوڈ متھیوز، رالف رسل، ضیاالدین شکیب وغیرہ سے ملاقات کی۔ لندن کے عجیب موسم، وہاں کے چہل پہل، لوگوں کے رویے۔ ریلوے اسٹیشن، یونیورسٹی، برٹش میوزیم نیشنل آرٹ گیلری، میڈم ٹساڈ کا مومی عجائب گھر، دریا کے تیمز، کیمبرج شیکسپیئر کے وطن وغیرہ کی سیر کی انگریزوں کی معاشرت، عادات، اطوار ڈسپلن کا ذکر کیا۔ تین ہفتہ وہاں رہ کر وہ ایمسٹرڈم جینوا، پیرس ہوکر دہلی آگئی۔ مشاہدات ابن بطوطی ان کا ایک اور سفرنامہ ہے۔ یہ ان کا پیرس، لندن، امریکہ، کا سفرنامہ ہے جو پہلے کتاب نما میں دسمبر ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۴ء بالاقساط شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے مزاح سے کام لیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ امریکہ کے سفر پر مشتمل ہے۔ صغریٰ نے یہ سفر صالحہ عابد حسین کے ساتھ ان کے علاج کے سلسلے میں کیا تھا۔ یہ لوگ کویت ایرویز کے جہاز سے پہلے لندن پہنچے۔ وہاں کے سیر کی۔ پھر نیویارک روانہ ہوئے، یہ سفر ۷ گھنٹے کا تھا۔ جسے انھوں نے محفوظ کرلیا۔ میخانوں کا پتہ۔ (سفرنامہ مکہ مدینہ سے عراق وایران) (شائع کردہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال۔ ۲۰۰۵ء) صغریٰ مہدی کی یہ کتاب ان کا کوئی مسلسل سفرنامہ نہیں۔ بلکہ درجہ ذیل سفرناموں کا مجموعہ ہے:
(۱) میخانوں کا پتہ:۔ (سفرنامہ۔ مکہ مدینہ عراق ایران شام)۔ (۲) سات دن کیکو کے دیس میں (جاپان)۔ (۳) سمندر سمندر۔ سمندر اور ٹک ٹک (نیکاک بالی۔ پھکیت)۔ (۴) ایک بار پھر امریکہ۔ (۵) ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو (لندن، برسی لونا (اسپین)

قرۃ العین حیدر اردو کی عظیم وناموار ادیبہ ہیں۔ انہوں نے سوائے چند مشرقی آسٹریلیائی اور افریقی وجنوبی امریکہ ممالک کے باقی تمام دنیا کی خاک چھان ڈالی ہے۔ ہندوستان کے کثیر مقامات کی انہوں نے سیر کی اور جاپان، روس، ایران، یورپی ممالک کے باقی تمام دنیا وامریکہ کے بے شمار شہروں علاقوں کی سیاحت کی۔ انہوں نے اپنے اشعار کا بیان سفرنامہ و رپورتاژ دونوں کی ملی جلی تکنیک میں کیا ہے۔ اس لئے ایک عام قاری کنفیوژ ہو جاتا ہے کہ اس کی اس قسم کی تحریروں کو سفرنامہ میں شمار کرے یا رپورتاژ میں۔ نقادان فن کی کچھ تحریروں کو سفرنامہ اور کچھ کو رپورتاژ میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں لندن لیٹر۔ ستمبر کا چاند، چھٹے اسیر تو، ورچمن ہر

طرقے کوہ دماوند، گل گشت، جہان دیگر، خضر سوچتا ہے۔ دکن سا نہیں تھا رسنسار میں۔ پھر ماندی کے کنارے وغیرہ اس کنفیوژن کا شکار ہیں۔ جمیل اختر صاحب نے قرۃ العین حیدر کے مطالعے میں ان تمام کو رپورتاژ میں شامل کیا ہے۔ جب کہ خالد محمود نے جہانِ دیگر اور دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار کو سفر نامہ کہا ہے۔ بشریٰ رحمٰن نے ستمبر کا چاند اور کوہ دماوند کو سفر ناموں میں شمار کیا ہے جبکہ کوہ دماوند نام کے مجموعے میں چھپئے اسیر تو بدلا ہوزمانہ تھا۔ کوہ دماوند، گل گشت خضر سوچتا ہے۔ دکن سے نہیں تھا سنسار میں، قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے کو رپورتاژ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں جہانِ دیگر شامل نہیں اسے بلٹز میں سفر نامہ امریکہ کہا گیا ہے۔، (۱۹۸۰ء کی اشاعتیں) مذکورہ بالا تحریر چونکہ رپورتاژی عناصر زیادہ ہیں اس لئے ان کو رپورتاژ یا سفری رپورتاژ کہنا مناسب ہوگا اور جہانِ دیگر کو سفر نامہ۔ جہان دیگر (مکتبہ اردو ادب، لاہور۔ ۱۹۷۰ء) اس سفر نامے میں قرۃ العین حیدر نے اپنے مخصوص افسانوی اسلوب سے کام لیا ہے۔ جو ان کی مخصوص شناخت ہے۔ ان کا اسلوب بیان ہندوستانی الساطیر، قدیم روایتی قصص، داستانوں، صوفیوں، سنتوں کے روحانی وسیلوں، ہندوستانی تاریخ تہذیب وثقافت کے ملے جلے عناصر سے ابھرتا ہے۔ وہ حال، ماضی، کے درمیان تحریری سفر طے کرتی رہتی ہیں۔ ان کی تحریر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے قاری کا مختلف علوم وفنون، ادبیات، مذہبی، صحائف، تاریخات، قدیم وجدید کی مختلف معلومات اور مختلف تصورات وتوہمات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قرۃ العین اپنے سفر ناموں میں ظاہر سے زیادہ باطن میں محو سفر نظر آتی ہیں۔ ان کے بیانات میں صفائی وافکار کی بہتات ہے۔ ان میں تحیر کا عنصر کافی ہوتا ہے۔ قاری ان کے منفرد اسلوب نگارش حسین تشبیہوں، بلیغ تلمیحات اور تبصروں میں مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پس منظر میں جہانِ دیگر پر نظر ڈالی جائے تو ایک جہانِ معانی نظر آتا ہے۔ یہ مصنفہ کے سفر امریکہ کی روداد ہے۔ اس میں امریکہ کا سفر، وہاں کی سیر، مختلف مقامات، شہروں مناظر، حالات کوائف، معاشرت، لوگوں کے رویوں، اشیاء، عمارات، مقامات، ماضی وحال کی باتوں، تاریخی، سیاسی، سماجی ومعاشرتی، اقتصادی، ادبی، ثقافتی، تمام باتوں کو دلکش افسانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانویت، ڈرمائیت، تاریخیت، فلسفہ، ادب، مزاح کا ایسا انوکھا امتزاج کہیں اور نظر نہیں آتا۔

ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے سفر نامے ہیں جو اکیسویں صدی میں شائع ہوئے۔ لیکن مندرجہ بالا خواتین کے سفر ناموں نے اردو سفر ناموں کی تاریخ میں نئی وسعتوں کا اضافہ کیا۔ اب تک کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین قلم کاروں نے بہت عرق ریزی سے یہ سفر نامے لکھ کر یادوں کو محفوظ کرنے کے ساتھ اس عہد کی اپنے گرد وپیش کی زندگی، حالات وواقعات کو بھی محفوظ کر لیا۔ اسی وجہ سے ان تمام سفر ناموں کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ''اردو سفر ناموں کی تاریخ میں خواتین ہند کی خدمات'' یقیناً ایک اہم اور وسیع موضوع ہے، جس کو چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی

وقار عظیم اپنے مضمون ''کہانی کی منطق'' میں لکھتے ہیں: ''کسی نے کہانی کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ [کہانی ایک حل طلب معمہ ہے۔] اور یہ بات سچ ہے اور معتبر سے معتبر منطق بھی اس بات کو سچ تسلیم کرے گی کہ کہانی میں اگر معمہ کی کیفیت نہ ہو تو پڑھنے والے یا سننے والے کے لیے اس میں ذرا بھی کشش نہیں۔ کہانی کا معمہ ہونا ہی اسے دلچسپ بناتا ہے۔ کہانی ایک اہم اور بعض صورتوں میں پیچیدہ سوالیہ نشان ہے۔۔۔ اس بات کو کسی اور نقاد نے یوں کہا ہے کہ [کہانی سوال سے جواب تک کے سفر کا نام ہے۔] یا یوں کہیے کہ کہانی کے شروع ہوتے ہی اس کے سننے اور پڑھنے والے کے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ واقعات کی رو کے ساتھ یا کرداروں کے عمل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے کہانی سنانے والے کا کام بس اتنا ہے کہ کہانی کو سوال سے شروع کر کے جواب تک پہنچا دے۔''

''کہانی کی منطق، وقار عظیم، ص ۱۴، رسالہ فنون لاہور، ۱۹۶۳''

مذکورہ بالا اقتباس کے درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی کہانی پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کے ابتدا میں سوال تو قائم کیا گیا ہے لیکن کہانی کے اخیر تک جواب سے قارئین نا آشنا ہی رہے۔ اس کہانی کو ایک نہیں بلکہ چھ ادیبوں نے مل کر مکمل کیا ہے۔

''ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی'' ۷۲ صفحات پر مشتمل ایک طویل افسانہ ہے اس کے چھ حصے ہیں۔ افسانے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے ہر حصے کو علیحدہ علیحدہ ادیبوں نے تحریر کیا ہے۔ اس کی پہلی قسط نیاز فتحپوری نے، دوسری علی عباس حسینی نے، تیسری ل۔ احمد اکبرآبادی نے، چوتھی سجاد حیدر یلدرم نے، پانچویں امتیاز علی تاج نے، چھٹی اور آخری قسط خان بہادر حکیم احمد شجاع نے تحریر کی ہے۔ اس طویل افسانے کو پہلے لکھنؤ ریڈیو پر نشر کیا گیا پھر آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے 'کتب خانہ علم وادب دہلی' نے ۱۹۳۹ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کا پلاٹ پہلے سے متعین نہ تھا۔ ہر ادیب نے کہانی کو اپنا مخصوص رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا کہانی اکثر جگہوں پر غیر مانوس اور پھسپھسی ہوگئی ہے۔ پہلی اور آخری قسط کے درمیان ربط برقرار نہیں رہ سکا اور اس میں بار بار عجیب وغریب تبدیلی نظر آتی رہی۔ پلاٹ میں الجھاؤ صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ صادق الخیری اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ریڈیو والوں نے پلاٹ خود ہی تجویز کر دیا تھا اور ان حضرات کو جنھوں نے اس میں حصہ لیا اس کی تکمیل کی دعوت دی۔ یا ہر شخص کو اختیار تھا کہ جس طرح چاہے پلاٹ بناتا چلا جائے۔ غالباً دوسری صورت ہوئی ہے۔ اسی لیے آخری قسط پہلی قسط سے حد درجہ اجنبی اور کہیں زیادہ دلچسپ اور پر لطف ہے۔ چھ ادیب اور ایک کہانی افسانوی ادب کا ایک نیا تحفہ ہے اور چوں کہ اسے پیش ریڈیو والوں نے کیا اس لیے اس جدت پسندی

اور ہمارے افسانوں کے باب میں ایک اچھوتا اضافہ کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔''

''ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی، ص ۳''

کہانی کی ابتدا مرزا اسد علی بیگ کی بیماری سے ہوتی ہے۔ اس کا تانا بانا ان کے لڑکے مرزا سعید بیگ، اس کی بچپن کی منکوحہ ریحانہ کے ذاتی مسائل، تعلیم اور دونوں کے مابین خیالات کے فرق کو سامنے رکھ کر بُنا گیا ہے۔ کہانی کی شروعات اس طرح ہوتی ہے۔ مرزا اسد علی پر اچانک فالج کا حملہ ہو جاتا ہے۔ مصنف نے مرزا اسد علی بیگ کا تعارف کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ قاری پر ان کی شخصیت کا اثر کہانی کے آخر تک باقی رہتا ہے:

''مرزا اسد علی بیگ دار انگر کے رئیس قصبہ کے ان چند معززین میں سے تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی ایک وضع ایک ادا اور ایک شان سے بسر کر دی۔ اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ ان لوگوں کی یادگار تھے جو انسانی ہمدردی کے مقابلہ میں تمام ذاتی اغراض کو بھلا دیتے ہیں، اور دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانے میں خاص لذت اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔۔۔ مرزا جی خاندانی رئیس تھے لیکن ان امیروں کی طرح نہ تھے جو اپنی ساری عمر اس کوشش میں صرف کر دیتے ہیں کہ باپ دادا کی دولت کو کیوں کر ضائع کیا جائے۔ انھوں نے نہایت فراخ دلی سے خاندان کے ہر شخص کی خدمت کی اور اپنے اور اپنے عزیزوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ بے دریغ روپیہ صرف کیا۔''
(ص:۶، ۷)

نیاز فتحپوری نے کہانی کی ابتدا میں جو سماں باندھا ہے، حکیم احمد شجاع تک جاتے جاتے وہ قائم نہ رہ سکا۔ پہلی قسط میں کہانی کے کرداروں اور ان کے خیالات سے قاری کو روبرو کرایا گیا ہے۔ مرزا جی کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے، سعید ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی تعلیم کے لیے مرزا بہت پریشان ہیں مگر وہ کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ ابتداً عربی فارسی کی تعلیم دی گئی جس میں کامیاب نہ ہوا تو مرزا نے انگریزی تعلیم کا بندوبست کیا لیکن مرزا کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ تیسری جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ ''اس کا فطری میلان کچھ نہ کرنا تھا اور اس نے یہ کر دکھایا۔'' اس وجہ سے باپ بیٹے سے خفا رہتے تھے۔ ریحانہ مرزا کی یتیم بھانجی ہے، لہٰذا بہن اور بھانجی کا ذمہ انہیں کے کندھوں پر ہے۔ سعید اور ریحانہ کا کم سنی ہی میں نکاح ہو گیا ہے۔ مرزا کو ریحانہ سے بڑی محبت تھی لہٰذا اس کی تعلیم کے لیے خاص طور سے ایک انگریز لیڈی کا انتظام کیا گیا۔ اسے مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم دی گئی۔ ریحانہ ایک کھلے ذہن کی انگریزی تعلیم یافتہ مہذب لڑکی ہے۔ مذہب کو وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ عورت اور پردہ کے متعلق بھی وہ خاص ذہن رکھتی ہے۔ حالانکہ ریحانہ اور سعید کی فکر میں کافی فرق ہے۔ نیاز کے الفاظ یوں ہیں:

''ریحانہ کی عمر اس وقت ۲۰ سال کی تھی اور سعید کی چوبیس سال۔ شکل وصورت کے لحاظ سے دونوں برے نہ تھے قریب قریب ایک سے تھے۔ لیکن مزاج کے لحاظ سے دونوں میں بڑا اختلاف تھا۔ سعید نہایت وہمی سے انسان تھے اور ہر چیز کا مطالعہ وہ حد درجہ پست ذہنیت اور انتہائی مایوسانہ انداز سے کیا کرتے تھے۔۔۔ ریحانہ کی پرورش بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی جس میں سعید کی لیکن نئی تعلیم نے اس کے ذوق کو ان سے بالکل مختلف کر دیا تھا وہ

یقیناً عام تعلیم یافتہ عورتوں کی طرح بے باک اور آزاد نہ تھی لیکن یہ ضرور سمجھتی تھی کہ دنیا میں عورت بھی اپنی ہستی مرد سے علاحدہ رکھتی ہے۔۔۔اس کی وضع قطع میں نئی تعلیم نے کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔۔۔ پردہ کا مفہوم اس کی نگاہ میں صرف نسائی خودداری تھا۔ وہ گھونگھٹ نقاب جھلمل، چلمن، اوٹ اور گھر کی اونچی اونچی دیواروں کی زیادہ قائل نہ تھی۔'' (ص:۱۰،۱۱)

اس اقتباس سے ریحانہ کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ عورت بے پردہ ہو کر سماج کی عام ملکیت بن جائے۔ اعلیٰ تعلیم نے ریحانہ کی فکر کو بلند کر دیا تھا۔ حالانکہ اسے یہ معلوم تھا کہ سعید، جس سے بچپن میں اس کا نکاح ہو چکا ہے وہ ان تمام باتوں کو پسند نہیں کرتا اس کے باوجود اس نے جن چیزوں کو درست پایا ان پر سختی سے عمل پیرا رہی۔

فالج کے حملے سے مرزا اسد علی بیگ کی موت ہو گئی۔ والد کے انتقال کے بعد سعید کئی مہینوں تک وراثت کے جھمیلوں میں پھنسا رہا۔ ان کاموں سے فرصت کے بعد اس کے ذہن میں ریحانہ کی رخصتی کا خیال آیا اور وہ اپنی پھوپھی کے گھر پہنچ گیا۔ پھوپھی کی اجازت سے وہ ریحانہ سے ملنے اس کے کمرے میں گیا، ریحانہ کو پہلے ہی سعید کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ چنانچہ اس نے سعید کی جو درگت بنائی اس کا نقشہ نیاز نے بڑی نزاکت سے کھینچا ہے، ملاحظہ کریں:

''(ریحانہ) نے باریک آسمانی رنگ کی ساڑی پہنی جس سے اس کا جسم جھلکتا تھا۔۔۔ الغرض سعید کے لیے وہ ہمہ تن جنت کا وہ درخت بن کر رہ گئی جسے چھونے کی آدم کو ممانعت کی گئی تھی۔۔۔ وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگے کہ ان کا دم گھٹا جا رہا ہے، اور وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، بجائے ریحانہ ان سے حجاب کرتی خود ان کا جی چاہتا تھا کہ شرما کر منہ چھپا لیں۔'' (ص:۱۴،۱۵)

ریحانہ کا چھوٹا سا کمرہ جس کی فضا، خوشبو، سجاوٹ و سنگار بالکل انگریزی طرز پر کی گئی تھی۔ انگریزی سینٹ کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی جو لوبان کی سیج کی مہک میں رہنے والے سعید کے لیے پریشان کن تھی، اس کا دم گھٹا جا رہا تھا اور وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

دوسری قسط میں کہانی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی کی ہے۔ حالانکہ مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کہانی کو ایک قدم بھی آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ نیاز نے کہانی کو جہاں چھوڑا حسینی وہیں چکر لگاتے رہے، انھوں نے جزئیات کو خوب تفصیل اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس میں کمرے کا نقشہ اس کی سجاوٹ، سعید کی بے چینی، ریحانہ کے لباس کی تفصیل اور سعید پر طنز کرنا وغیرہ شامل ہے۔ ریحانہ مشرقی عورتوں کی طرح اندر ہی اندر ڈری سہمی تو ضرور تھی لیکن اس ڈر کو ظاہر کر کے شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہ تھی۔ سعید کا اندازہ تھا کہ وہ ریحانہ پر اپنا رعب ظاہر کرے گا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ اقتباس دیکھیں:

''عورت تھی پڑھی لکھی سمجھدار اور سعید کے معاملہ میں تجربہ کار بھی اس لیے اس نے اس ڈر کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ چہرہ سے یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ ان کی ہر بات پر ہنس رہی ہے اور ان کا مذاق اڑا رہی ہے۔ سعید بھی ریحانہ کی اس مسکراہٹ سے اچھی طرح واقف تھے۔'' (ص:۱۷)

ریحانہ کے کمرے کی سجاوٹ اور اس کا لباس دیکھ کر سعید بہت شرمندہ ہوا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شرمندگی کے باعث وہ زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ اس کی نظر بار بار اپنے میلے کپڑوں اور جوتوں پر ٹھہرتی، اس نے ایک پاؤں سے دوسرے جوتے کی گندگی کو صاف کرنا چاہا، ریحانہ یہ تمام منظر بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ سعید کو سنجیدگی سے گفتگو کا موقع ہی نہ دیا جائے اور اس کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ اگر آپ جوتے کی خاک جھاڑنا چاہتے ہیں تو میں کوئی صافی لا دوں؟ اس سوال سے سعید کی وہی حالت ہوئی جو اس چور کی ہوتی ہے جو چوری کرتے پکڑ لیا جاتا ہے۔ اس طرح ریحانہ سعید کی حرکات وسکنات پر مسلسل طنز کرتی رہی۔ اس کی حرکتوں سے وہ آپے سے باہر ہو گیا، وہ جلد سے جلد کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ سعید کی کیفیت کو حسینی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''آدمی کی صورت سے گھبرانے والے، ویرانوں، خانقاہوں اور ٹوٹے کھنڈروں میں یکسوئی قلب پانے والے سعید آج پہلے پہل ایک مرصع کمرے میں ریحانہ کی سی جوان، تعلیم یافتہ اور چنچل خاتون سے ملنے آئے تھے۔۔۔ کمرہ کیا تھا نگار خانہ۔ عورت کیا تھی بس سے بھری ناگن۔ باتیں کیا تھیں بجلیاں گر رہی تھیں۔ آدمی اپنے حواس میں ہو تو ارادوں پر عمل بھی کرے، لیکن جب حواس ہی بجا نہ ہوں تو بھلا نصیحتیں کیا خاک سوجھیں۔''
> (ص:۲۰،۲۱)

سعید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ریحانہ سے باتوں سے جیتنا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہر عمل اور ہر بات پر جملے کس رہی ہے۔ لہٰذا سعید نے آج بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔ ریحانہ کی انگریزی تعلیم، مرحوم ماموں کی بدولت ہوئی تھی۔ اگر ماں کا بس چلتا تو یہ ہرگز ممکن نہ تھا کیوں کہ وہ لڑکیوں کے تعلیم کے حق میں بالکل نہ تھیں، ان کی نظر میں عورتوں کے پڑھنے لکھنے میں نقصان ہے، تعلیم سے ان کا دماغ پھر جاتا ہے۔ اچھی بھلی شریف زادیاں خاصی بے شرم اور ڈومنیاں بن جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ ریحانہ کو کبھی پڑھائی لکھائی کی اجازت نہ دیتیں۔

ریحانہ کی ماں پرانے خیالات کی پروردہ، شوہر اور بزرگوں کی بے پناہ عزت کرنے والی خاتون تھیں۔ یہی توقع انھیں ریحانہ سے بھی تھی لیکن ریحانہ بلند خیالات کی مالک، جدید تعلیم سے آراستہ نوجوان خاتون تھی وہ غلط بات کو کسی صورت میں صحیح کہنے کے حق میں نہ تھی۔ ماں بیٹی کے خیالات میں تضاد تھا اور اسی بنیاد پر ان میں اکثر تکرار ہوتی تھی۔ ماں اگر یہ کہتی کہ بیٹی عورت کی بخشش اسی میں ہے کہ وہ مرد کے پاؤں دھو دھو کے پیے۔ تو بیٹی کہتی کہ امی عورت مرد کی ماں ہے اور جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ ماں سمجھاتی کہ بیٹی تمہیں سعید کی عزت کرنی چاہیے وہ تمہارا شوہر ہے، تو بیٹی فوراً جواب دیتی کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہوں اور عزت علم کی ہوتی ہے نہ کہ جہالت کی۔ دوسری قسط میں کہانی نے مزید کوئی سفر طے نہیں کیا، ممکن ہے کہ لکھنے کی کچھ ایسی شرائط رہی ہوں کہ کہانی میں کس کو کیا لکھنا ہے۔ سعید کے کمرے سے نکلتے ہی دوسری قسط اپنے اختتام کو پہنچی ہے۔

تیسری قسط میں کہانی کی باگ ڈور ل۔ احمد اکبرآبادی کے ہاتھوں میں ہے۔ انھوں نے کہانی میں مذہبی رنگ کی آمیزش کی ہے۔ سعید نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا کہ عصر کا وقت نکل رہا ہے، اس پر پھوپھی نجمہ نے جواب دیا بھیا تخت پر مصلیٰ بچھا ہے، نماز پڑھ کر ذرا سا ناشتہ کر لو پہلی دفعہ تو آئے ہو۔.....(باقی آئندہ)

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر جامعہ عثمانیہ

بت کدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھ

برہمن واد اس ملک کا ناسور ہے، برہمن جب سے اس ملک میں آئے ہیں انھوں نے یہاں کے باشندوں (مول نواسیوں) کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، غلامی کی یہ زنجیر اتنی مضبوط ہے کہ گوتم بدھ، مہاویر اور گرونانک جیسے مہاپرشوں سے بھی اس کی تمام کڑیاں ٹوٹ نہ سکیں، ان کی کوششوں سے یہ زنجیر کچھ ڈھیلی تو ہوئی مگر برہمنوں نے کمال ہوشیاری سے اسے پھر جکڑ لیا، مسلم عہد سلطنت میں صالح علما وصوفیا سے متاثر ہوکر ایک بڑی تعداد بلکہ بہت بڑی تعداد غلامی کی اس زنجیر سے آزادی پاکر حلقہ بہ گوش اسلام ہوئی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ برہمن طبقہ مذہبی رواداری کے نام پر مسلم سلاطین کے دربار سے آشیرواد حاصل کرتا رہا اور مذہب پر عمل کی آزادی کے بہانے منوواد کا تحفظ کرتا رہا، انگریزی دور استعمار میں جیوتی راؤ پھولے، شاہو جی مہاراج اور ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ کی کوششوں سے برہمن واد کے شکار طبقات میں بیداری ضرور پیدا ہوئی مگر یہ بیداری برہمن واد کو اس کے انجام تک نہ پہنچا سکی، بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول سے ہی برہمن دو حصوں میں تقسیم ہونا شروع ہوئے، ایک نے انتہا پسندی کو اختیار کیا اور دوسرے نے مصلحت پسندی کی راہ کا انتخاب کیا، ایک نے نیشنلزم کا سہارا لیا اور دوسرے نے سیکولرزم کا علم اٹھایا، مسلمان سیکولرزم کا لبادہ اوڑھنے والے مصلحت پسند برہمنوں کے ساتھ ہوگئے۔ برہمنوں کے دوسرے حصے نے ہندوتو کا لبادہ اوڑھا اور سماج کے ان تمام طبقات کو جنھیں انھوں نے ہزاروں سال سے غلام بنا رکھا ہے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا شروع کیا، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا؛ مگر انھوں نے 1924 سے اپنے سفر کا جو آغاز کیا تو حالات سے بے پروا اور سنگ راہ سے بے خوف ہوکر مسلسل سرگرم سفر رہے، جوں جوں ان کا سفر آگے بڑھتا گیا ان کا کارواں بھی بڑا ہوتا گیا، ''شودر'' اور ''اتی شودر'' بھی ان کے دام ہم رنگ زمیں میں پھنستے گئے اور ''ہندو'' کے جھنڈے تلے جمع ہوتے گئے، یوں جو طبقات کسی زمانے میں برہمنوں کو ظالم اور دشمن سمجھتے تھے وہ بھی برہمن واد کے نئے لباس ''ہندوتو'' سے دھوکہ کھا گئے اور بہروپیے کو پہچان نہ سکے، ان کی فریب خوردگی میں اضافہ کے لیے رامائن اور مہابھارت کے سیریل چلائے گئے تاکہ برہمنوں کی سنسکرتی گھر گھر پہنچ جائے اور رام اور کرشن کے نام پر سماج کے تمام طبقات کو متحد کیا جاسکے، مسلمانوں کے خلاف تمام شودروں اور اتی شودروں کو ایک صف میں کھڑا کرنے کے لیے بابری مسجد کا پروپیگنڈہ رچا گیا یہاں تک کہ اس کو شہید کردیا گیا، اس کے بعد بھی برہمنیت کا قافلہ اپنی منزل کی طرف محو سفر رہا، وہ نہ تھک کر کہیں رکا اور نہ ڈر کر کہیں جھکا، یہاں تک کہ 2014 میں وہ تخت اقتدار تک پہنچا، اب برہمنیت کا وہ ورژن جو مصلحت پسندی کے ساتھ سیکولرزم کے سہارے چل رہا تھا وہ کنارے ہوا اور برہمنیت کا وہ ورژن جو انتہا پسندی کو اپنی پہچان بنا کر محو سفر تھا ایوان حکومت میں اکثریت کے ساتھ داخل ہوا 2019 میں اس کی تعداد اور اس کی طاقت میں حیرتناک اضافہ ہوا، اس کے بعد سے یہ گولوالکر کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے، ساورکر کے خاکوں میں رنگ بھرنے اور ہیڈگوار کے عزائم کو انجام تک پہنچانے میں

مسلسل مصروف ہے، این آر سی کیا ہے؟ این ای پی کیوں لائی گئی ہے؟ یہ سب اُسی مقصد تک پہنچنے کی کوشش ہے جسے ہندو راشٹر کا نام دیا گیا ہے، جب کہ یہ ہندو راشٹر نہیں برہمن واد، منو واد اور سنگھ واد ہے، اجودھیا میں بھومی پوجن کر کے اس نئے نظام کی باضابطہ بنیاد رکھ دی گئی ہے، اب سیکولرزم ایک بے معنی لفظ ہے۔

ایک طرف برہمن واد اور سنگھ واد کا اثر ورسوخ بڑھتا جارہا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کا قافلۂ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے، ایسے میں مسلمان دوراہے بل کہ چوراہے پر کھڑا ہے، کش مکش کا شکار ہے کہ آخر کدھر جائے؟ وہ ان حالات سے کیسے نمٹے؟ ان مشکلات سے کیسے نکلے؟ برہمن واد وسنگھ واد سے کیسے مقابلہ کرے؟ اس موضوع پر لکھی جانے والی تحریروں کا جائزہ لیں تو عام طور سے وہ دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک وہ جس کا بیانیہ (Narrative) کچھ یوں رہتا ہے کہ مسلمان اٹھیں اور دشمن سے بدلہ لیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا، اب دشمن کو بتانا ہوگا کہ ہم بزدل قوم نہیں ہیں، یہ تحریریں صرف مسلم قوم کو خطاب کرتی ہیں، اور ان تحریروں میں محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد وغیرہ کی مثال دے کر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اقلیت میں تھے لیکن انھوں نے سندھ فتح کیا اور اندلس پر اسلامی پرچم لہرایا، ہم بھی گرچہ اقلیت میں ہیں؛ لیکن اگر ہم اٹھیں گے تو ہم بھی اس ملک کی تقدیر بدل دیں گے، اور بعض لوگ افغان وترک کی مثال بھی دیتے ہیں۔ اس طرح کی تحریروں کا یہ جو بیانیہ ہوتا ہے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے؛ کیوں کہ اللہ کے یہاں کوئی چیز ناممکن نہیں، مگر اللہ نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، اسی لیے اسباب کے پیش نظر ہمیں یہ بیانیہ مسئلہ کا حل نہیں لگتا، اس کی چار وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس وقت عالم اسلام کی مرکزیت اور امت پن کا تصور دونوں مفقود ہیں، جب تک عالم اسلام کو مرکزیت نصیب نہ ہو جائے یا کم از کم مسلم ملکوں میں امت پن کا تصور نہ پیدا ہو جائے تب تک ماضی کی عسکری مثالوں پر بہ ظاہر عمل نہیں کیا جاسکتا، دوسری وجہ یہ کہ اس دور کے وسائلِ جنگ ماضی کے وسائلِ جنگ سے بہت مختلف ہیں، ہمیں اس دور کے ترقی یافتہ وسائلِ جنگ حاصل نہیں ہیں، تیسری وجہ یہ کہ اس ملک کی سیاسی، سماجی اور جغرافیائی صورتحال افغان وترک سے یکسر مختلف ہے، چوتھی وجہ یہ کہ اس ملک میں ہمارا دشمن کسی عسکری تصادم کے بغیر اپنے نظریہ کی ذہن سازی کے ذریعہ اس مقام تک پہنچا ہے، گویا اس سے ہماری نظریاتی جنگ ہے، اس نے یہ نظریاتی جنگ اس لیے جیت لی کہ اس نے اس ملک کی اکثریت کو اپنا ہم نوا بنالیا ہے، اس کے نظریہ کی بنیاد ہی یہی ہے کہ اس ملک کی اکثریت کو مسلمانوں کے خلاف کر دیا جائے، لہذا ہر وہ بیانیہ جو صرف مسلمانوں کو خطاب کرے اور بقیہ برادران وطن کو دشمن کی صف میں شمار کرے اس سے غیر شعوری طور پر دشمن ہی کا فائدہ ہوگا، بلکہ دشمن جس مقصد کے لیے سو سال سے محنت کر رہا ہے اس مقصد میں اس کا تعاون کرنا ہوگا۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی دوسری قسم کی تحریر وہ ہوتی ہے جس کا بیانیہ (Narrative) کچھ یوں رہتا ہے کہ ہم تو اقلیت میں ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم اس ملک میں مجبور ہیں۔ یہ بیانیہ پہلے بیانیے کے برعکس ہے، اس قسم کی تحریروں سے مایوسی، احساس کمتری اور خوف مترشح ہوتا ہے، ان تحریروں کے لکھنے والے معذرت خواہانہ انداز میں لکھتے ہیں، اور ہمیشہ دفاعی موقف میں رہتے ہیں، دفاعی موقف اختیار کرنا کبھی ضروری ہوتا ہے؛ مگر ہمیشہ دفاعی موقف میں رہنا اور دفاع کرتے ہوئے آگے بڑھنے کے بجائے دشمن جہاں تک پیچھے ڈھکیلے وہاں تک چلے جانا مومنانہ جرات اور مجاہدانہ عزیمت کے خلاف ہے، اس طرح کی تحریریں لکھنے والوں پر بسا اوقات

معذرت خواہانہ اور مدافعانہ نفسیات کا اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ سیکولرزم اور نیشنلزم کی تاویل کرنے اور اسلام کے نظام ہائے حیات ونظریۂ جنگ وقتال کی تشریح کرنے میں دین کی صحیح رہنمائی نہیں کر پاتے، یہ بیانیہ بھی چار وجہوں سے صحیح نہیں ہے، ایک تو یہ کہ اس سے ہم صرف اعتراضات کے جوابات دینے میں ہی رہ جاتے ہیں اور وہ بھی معذرت خواہانہ انداز میں، دشمن کو شکست دینے کے لیے یہ ناکافی ہے، دوسری وجہ یہ کہ ہمیں ''اقلیت کے احساس کمتری'' میں مبتلا دیکھ کر دشمن کے حوصلے جواں ہوتے ہیں اور مسلم قوم کے دلوں میں مایوسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ ہم مخصوص نفسیات کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کی کوشش کرتے ہیں تو ہم ترجمانی کا حق ادا نہیں کر پاتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ ہم اپنے مخالفین کو ایک اکائی مان کر چلتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری کوششیں یک رخی ہو جاتی ہیں۔

یہ دور نظریاتی جنگ کا ہے، ہمارا دشمن بھی نظریاتی جنگ کے ذریعہ ہی یہاں تک پہنچا ہے، اس سے انکار نہیں کہ اس نے عسکری طاقت بھی بنائی ہے اور فسادات میں ہتھیار کا استعمال بھی کرتا ہے؛ مگر ان سب کے پیچھے در اصل اس کی آئیڈیولوجی ہی کارفرما ہے، برہمن جو کہ اس ملک کے طبقاتی نظام میں سب سے بڑی اقلیت ہے اس نے ایک ایسا نقطۂ نظر اپنایا کہ جس کے تحت اس نے اس ملک کے بکھرے اور بچھڑے سماج کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا اور اس طرح وہ اقلیت سے اکثریت میں آ گیا، وہ نقطۂ نظر ہے ''ہندو تو'' کا، اس نے ''ہندو'' لفظ کے ذریعہ بھارت کے تمام طبقات کو متحد کیا، اس نے کہا کہ تم سب ہندو ہو اور تم سب ایک ہو، حتی کہ ایس سی، ایس ٹی کے نوجوانوں کو بھی اس جال میں پھنسا لیا، حالاں کہ ایس سی، ایس ٹی کے تعلیم یافتہ اور باشعور دانشوران ہندو ہونے سے انکار کرتے ہیں، اور ۱۹۱۰ کے مردم شماری کمیشن نے اصل ہندو اور نام کے ہندو کے درمیان فرق کرنے کے لیے جو دس معیارات وضع کیے تھے ان معیارات کے اعتبار سے بھی ایس سی اور ایس ٹی ہندو سے خارج ہو جاتے ہیں، مگر برہمن نے ان دونوں طبقات کے نوجوانوں پر ایسا جادو کیا ہے کہ ان کو سمجھانا ان کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقے کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔

برہمن نے اکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع رکھنے اور ہندوتو کا نشہ تیز کرنے کے لیے مختلف الفاظ کا سہارا لیا ہے جن میں ''رام''، ''گائے''، ''دیش بھکتی'' اور ''بھارتی سنسکرتی'' کے الفاظ قابل ذکر ہیں، برہمن اور سنگھ نے ان الفاظ کا تقدس یہاں کے مختلف طبقات کے دلوں میں اس قدر راسخ کر دیا ہے کہ وہ ان الفاظ کی وجہ سے سنگھ واد کے خیمے سے الگ نہیں ہو سکتے، دوسری طرف مسلم تاریخ کو مسخ کر کے اور مسلمانوں کو دیش دروہی باور کرا کے سماج میں نفرت کا ایسا زہر گھول دیا گیا ہے کہ ''ہندووں'' کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے اور ان سے لڑانے کے لیے تنہا نفرت کا یہ زہر ہی کافی ہے۔ برہمن اور سنگھ نے سو سال کی محنت کر کے ہندو لفظ کا سہارا لے کر اس ملک کی اکثریت کو اپنے خیمے میں جمع کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ اس کے خیمے سے کوئی ایک فرد بھی باہر جائے، اس لیے وہ ہر ایسے بیان یا ہر ایسے عمل سے خوش ہوتے ہیں جس سے ان کے خیمے میں رہنے والے افراد کا ان سے تعلق مستحکم ہوتا ہے، اس لیے ہمیں دشمن کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ غیر شعوری طور پر دشمن کا فائدہ نہ ہو۔

یہ بات اوپر آئی ہے کہ اس وقت عالم اسلام کی مرکزیت اور امت واحدہ کا تصور دونوں افسوسناک حد تک مفقود ہیں، اور مسلمان ترقی یافتہ جنگی وسائل سے محروم ہیں، نیز یہاں کی جغرافیائی، سیاسی اور سماجی صورتحال افغان وترک سے یکسر مختلف ہے، اس لیے ہمیں نظریاتی جنگ کے بغیر چارۂ کار

نہیں ہے، برہمن نے اقلیت میں ہونے کے باوجود ایک ایسے نقطۂ نظر کو اختیار کیا جس کی بنیاد پر اس نے اس ملک کی اکثریت کو اپنے خیمے میں جمع کرلیا، اسے شکست دینے کے لیے ہمیں بھی ایک ایسا نقطۂ نظر اپنانا ہوگا جس کی بنیاد پر ہم اس ملک کی اکثریت کو اپنا ہم نوا بنالیں، یہ نقطۂ نظر ہے برہمن واد کی مخالفت اور مظلوم ومحروم طبقات کے اتحاد کا، ان میں ایک تو وہ لوگ ہیں وہ جو ہزاروں سال سے مظلوم ومحروم رہے ہیں، دوسرے وہ لوگ ہیں جو آزادی کے وقت سے مظلوم ہیں، اول الذکر میں شودر اور اتی شودر اور آخر الذکر میں مسلمان آتے ہیں، شودر سے مراد موجودہ دستوری اصطلاح میں بی سی اور او بی سی ہیں جب کہ اتی شودر سے مراد ایس سی اور ایس ٹی ہیں۔ ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور مذہبی اقلیتوں کو ملایا جائے تو بھارت کی آبادی کا 85 فی صد بنتا ہے، جب کہ برہمنوں کی تعداد صرف ساڑھے تین فی صد ہے، بقیہ میں چھتری اور ویش آتے ہیں، صرف ساڑھے تین فی صد برہمنوں کا ملک کے تقریبا کلیدی مناصب پر بلاواسطہ یا بالواسطہ قبضہ ہے۔ برہمن وادیوں اور سنگھیوں نے اس نظریاتی جنگ میں جو صف بندی کی ہے وہ ''ہندو مسلم'' کی صف بندی ہے، ہم جب برہمن واد کی مخالفت اور مظلوم ومحروم طبقات کے اتحاد والی آئیڈیولوجی اختیار کریں گے تو یہ ایک نئی صف بندی ہوگی، اس صف بندی کو ''برہمن بہوجن'' کا نام دیا جاسکتا ہے، بہوجن کا لفظ گوتم بدھ نے برہمنوں کے مقابل طبقات کے لیے استعمال کیا ہے، جس کے معنی اکثریت کے آتے ہیں، گوتم بدھ نے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا تھا تاکہ دیگر طبقات کے اندر سے احساس کمتری دور ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ برہمنوں کے مقابلے میں ان کی اکثریت ہے۔ بہر حال ہندو مسلم کی صف بندی کی بجائے جب برہمن بہوجن کی صف بندی ہوگی تو جنگ کا رخ ہی تبدیل ہوجائے گا، اب مسلمان اقلیت میں ہونے کے بجائے برہمن اقلیت میں ہوجائے گا، ہندو مسلم صف بندی میں برہمن وادی اور سنگھ وادی طبقہ مسلمانوں کو باہری حملہ آور بتا کر بھارت کے دیگر طبقات کو ان سے متنفر کرنا چاہتا ہے، حالاں کہ مسلمان معمولی فی صد کے استثنا کے ساتھ اس ملک کے مول نواسی (اصلی باشندے) ہیں، جب کہ بہوجن برہمن کی صف بندی میں برہمن کو باہری حملہ آور ثابت کیا جاسکتا ہے اور یہ سچ بھی ہے؛ کیوں کہ 2001 کی ڈی این اے رپورٹ سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ برہمن یوریشیا سے آئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر نفرت کا پرچار نہیں کرسکتے؛ کیوں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا؛ البتہ نظریاتی جنگ میں ہم ان کے حملہ کا جواب دینے کے لیے اس ڈی این اے رپورٹ کو استعمال کرسکتے ہیں، برہمن اور سنگھ ہماری تاریخ مسخ کرکے مسلمانوں کو ظالم ثابت کرتے ہیں، نئی آئیڈیولوجی میں ہم خود برہمنوں کی مستند کتابوں سے انھیں بہ آسانی ظالم ثابت کرسکیں گے، خلاصہ یہ کہ اس نئی صف بندی سے جنگ کا پانسہ مکمل پلٹ جائے گا؛ مگر اس کے لیے عزم محکم اور جہد مسلسل کی ضرورت ہوگی، کم سے کم سو سال کا ہدف لے کر چلنا پڑے گا، اور منظم منصوبہ بندی اور موزوں حکمت عملی کے ساتھ ذہن سازی کا کام کرنا ہوگا، راہ میں تلخ تجربات سے گذرنا ہوگا، جن طبقات کو برہمن نے اپنے خیمہ میں لے رکھا ہے انھیں وہاں سے نکال کر لانا وقت طلب، محنت طلب اور صبر آزما کام ہوگا۔ مظلوم ومحروم طبقات کا متحدہ محاذ بنانے کے لیے لٹریچر کی کمی نہیں ہے، برہمنوں نے اپنی کتابوں اور دھرم شاستروں میں شودروں اور اتی شودروں کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ اگر منظم منصوبہ بندی اور معقول حکمت عملی کے ساتھ باہر لا لیا جائے تو بہوجن برہمن کی صف بندی کرنا آسان ہوجائے گا۔

برہمن وادیوں نے نظریاتی جنگ کے لیے جو صف

بندی کی ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ ہم لوگ ہندو نام کے تحت جمع ہونے والے سماج کے تمام طبقات کو ایک سمجھنے لگے، حالاں کہ وہ ایک نہیں ہیں، وہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہیں، لہذا ہم انھیں الگ الگ اکائی تصور کریں، اور غیر برہمن اکائیوں کا ایک متحدہ محاذ بنائیں، الگ الگ اکائیاں تصور کرنے کا مطلب سماج کو توڑنا نہیں ہے؛ بل کہ یہ جنگی حکمت عملی کا حصہ ہے، یہ بات سچ ہے کہ کافر ہونے میں سب برابر ہیں؛ لیکن کفار کو الگ الگ اکائیوں میں تقسیم کرنا بھی ثابت ہے، آپ ﷺ نے مدینہ کے مشہور تینوں یہودی قبائل کو الگ الگ اکائی تسلیم کیا، یہی وجہ ہے کہ جب ایک قبیلہ سے معاہدہ ٹوٹا تو باقی دو سے باقی رہا، پھر جب دوسرے سے ٹوٹا تو تیسرے سے باقی رہا، اگر تینوں ایک ہی اکائی ہوتے تو تینوں سے معاہدہ ایک ساتھ ہی ٹوٹ جاتا۔ اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں بھی غیر مسلموں کو دو الگ الگ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے اور دوسرے کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی اجازت دی گئی ہے (دیکھیے: سورۂ ممتحنہ : 8،9)۔ برہمن بہوجن صف بندی کا مطلب نفرت بھی نہیں ہے، بل کہ یہ تو سماج کے دیگر طبقات سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم انھیں برہمنیت کی غلامی سے نکال کر آزاد کریں اور پھر آہستہ آہستہ اپنے اخلاق اور اسلام کے پیغامِ مساوات کے ذریعہ انھیں اللہ کی غلامی کی طرف لے آئیں، یہ عین وہی کام ہے جس کا اعلان ربعی بن عامر نے رستم کے دربار میں کیا تھا کہ اللہ نے ہمیں بھیجا ہے کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی طرف لے کر آئیں۔ اسی طرح اس کا مطلب برہمن سے نفرت کرنا بھی نہیں ہے؛ بل کہ اس کا مطلب برہمنیت کے خلاف بغاوت کرنا ہے، اور ہر وہ نظام جو استحصال کو روا رکھے، انسانوں کو غلام بنائے اور سماج کو تقسیم کرے اس کے خلاف بغاوت کرنا نہ صرف جائز بل کہ واجب ہے، جہاں تک بات ہے برہمن کی تو اگر وہ برہمنیت کے خلاف ہے تو زنار اتار کر آئے اس کا استقبال ہے، ہمیں اس سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ بہوجن برہمن کی صف بندی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ غیر برہمنوں کو کلین چٹ دے دی جائے؛ بل کہ کوئی غیر برہمن اگر برہمنیت پر یقین رکھے اور برہمنیت کے نام پر سماج کو تقسیم کرے تو اسے بھی برہمن واد کی صف میں شمار کیا جائے گا، نظریاتی جنگ میں جو جس نظریہ کا حامی ہوگا وہ اس صف میں شمار ہوگا۔ برہمنیت کے خلاف بغاوت کرنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم برہمنوں کو اپنا مدعو سمجھنا چھوڑ دیں، ہرگز نہیں، وہ ہمارے مدعو رہیں گے، نظریاتی جنگ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمارے مدعو نہیں رہے، ہم انھیں حکمت و مصلحت کے ساتھ دعوت بھی دیتے رہیں گے، مگر برہمن واد کے خلاف جنگ بھی جاری رکھیں گے، ہماری جنگ ایک نظام کے خلاف ہوگی، وہ نظام جب تک رہے گا ہماری جنگ جاری رہے گی، اس جنگ میں اور دعوت کے کام میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم غیر برہمن طبقات کے محتاج ہیں، ہمیں آئیڈیولوجی کی یہ جنگ محتاجگی کی نفسیات کے ساتھ نہیں لڑنی ہے؛ بل کہ اس احساس کے ساتھ لڑنی ہے کہ اس ملک کو استحصال، ذات پات، چھوت چھات اور برہمن واد وسنگھ واد سے چھٹکارا دلا کر حکمت و مصلحت کے ساتھ آہستہ آہستہ اسلامی مساوات کی طرف لے کر آنا ہے، اگر ہم آئیڈیولوجی کی اس جنگ میں حقیقی معنوں میں کامیاب ہوگئے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ ؎

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

محمد احتشام انصاری۔شعبہ عربی فارسی الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

ڈاکٹر راحت اندوری: بحیثیت شاعر

ڈاکٹر راحت اندوری 1 جنوری 1950ء کو صوبہ مدھیہ پردیش کے شہر اندور میں پیدا ہوئے۔ والد رفعت اللہ قریشی اور والدہ کا نام النساء بیگم تھا ابتدائی تعلیم نوتن اسکول اندور اور اسلامیہ کالج اندور سے بیچلر مکمل کیا 1975ء میں برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے اردو ادب میں ایم اے کیا 1985ء میں مدھ پردیش کے مدھ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ان کے تحقیق کا موضوع ''اردو مشاعرے'' تھا کچھ عرصہ اندور یونیورسٹی شعبہ اردو میں ملازمت بھی کی بعد میں فلمی نگری ممبئی چلے گئے اور فلموں کے لئے گیت لکھتے رہے۔انہوں نے بہت سی فلموں میں نغمہ نگاری کی جیسے منا بھائی ایم بی بی ایس، آشیاں، قریب، مرڈر وغیرہ فلموں میں گانے لکھے۔

راحت اندوری نے پہلی شادی 1988ء میں مشہور شاعرہ انجم رہبر سے کی مگر یہ شادی راس نہیں آئی اور جلد ہی 1993ء میں طلاق ہو گیا پھر انہوں نے دوسری شادی سیمہ نامی خاتون سے کی جو آخری دم تک آپ کی ہم سفر رہیں۔

راحت صاحب عالمی سطح کے شاعر ہیں دنیا میں جہاں جہاں بھی اردو ہے وہاں وہاں راحت اندوری نے اپنی سلیس وسادہ اور بامعنی غزلوں سے لوگوں کو متاثر کیا اور خوب داد وتحسین حاصل کی انہیں مشاعروں کا بادشاہ Star Poet کہا جاتا ہے اردو مشاعرے میں انہیں لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سماعت کرتے تھے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا ان کے لب ولہجے میں بلا کی کشش ہوتی تھی اور ان کی شاعری لوگوں کے دلوں میں براہ راست اترتی چلی جاتی تھی گنگا کے پانی کی طرح ایک ایک لفظ صاف وشفاف ہوتا تھا راحت اندوری کو اردو کا سفیر کہا جا سکتا ہے وہ ہندی کے کوی سمیلنوں میں بھی اردو کا جادو جگاتے ہیں ہندی والے بھی ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

اگر خلاف ہیں ہونے دو جان تھوڑی ہے
یہ سب دھواں ہے کوئی آسمان تھوڑی ہے
لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے
جو آج صاحب مسند ہیں کل نہیں ہونگے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے
سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

میرے حجرے میں نہیں اور کہیں پر رکھ دو
آسماں لائے ہو لے آؤ زمیں پر رکھ دو
اب کہاں ڈھونڈنے جاؤ گے ہمارے قاتل
آپ تو قتل کا الزام ہمیں پر رکھ دو

راحت اندوری کے مندرجہ بالا اشعار کی مقبولیت کے حوالے سے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ راحت صاحب کے یہ اشعار نہ صرف مشہور ومقبول بلکہ عوام وخواص کے حافظے کا حصہ ہیں۔

اردو میں نظیر اکبر آبادی کو جمہوری یا عوامی شاعر کہا جاتا ہے کسے خبر تھی کہ اکیسویں صدی میں اندور کا رہنے والا ایک شاعر بھی عوامی شاعر کہلائے گا اس کی شاعری عوام کے

احساسات کی ترجمانی کرے گی ان کے دلوں کو جوش وخروش سے بھر دے گی مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن پیدا کرے گی راحت اندوری کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ وہ عوام کے خیالات اپنے کلام میں بیان کرتے ہیں 1986ء میں راحت اندوری نے کراچی کے مشاعرے میں ایک شعر پڑھا جسے لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ پانچ منٹ تک ہال تالیوں کی آواز سے گونجتا رہا پھر انہوں نے وہی شعر دہلی میں پڑھا تو یہاں بھی وہی منظر رہا۔

بعض شاعر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شعر کسی کی سمجھ میں مشکل سے آئے اور لوگ الفاظ کے معنی تلاش کرتے پھریں اور بعض شاعر وہ ہوتے ہیں جنہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ صدیوں بعد ان کا ادب انہیں کس طرح یاد رکھے گا وہ لمحہ موجودہ میں جیتے ہیں اور اپنی شاعری کے موضوعات آس پاس کے واقعات سے اٹھاتے ہیں راحت اندوری بھی اسی قسم کے شاعر تھے وہ حالات حاضرہ پر لکھنا اور پڑھنا پسند کرتے تھے۔

ڈاکٹر راحت اندوری مسلمانوں کی زبوں حالی پر مرثیہ اور ان کی عظیم تاریخ پر کس طرح قصیدہ خوانی کرتے ہیں شعر ملاحظہ ہو ۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

راشد علی لکھتے ہیں "منفی سیاست کے چال چلن کا بھرپور پوسٹ مارٹم کیا کرتے۔اپنے انوکھے انداز اور حسین امتزاج اور شاندار کلام سے لوگوں کے من موہ لیتے، بلاشبہ وہ اپنے ہم عصروں میں بلند پایہ مقام رکھتے تھے۔انہوں نے مشاعروں کو اپنے موجودگی سے پہچان بخشی، ان کے بغیر انٹرنیشنل مشاعرے ادھورے رہا کرتے "شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سرحدوں پر بہت تناؤ ہے کیا
کچھ پتہ تو کرو چناؤ ہے کیا

پلوامہ حملہ اور پارلیمانی انتخاب 2019 کے دوران یہ شعر بہت ہٹ ہوا راحت اندوری نے یہ شعر اس سے بہت پہلے کہا تھا ہند و پاک دونوں کی سیاست ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلنے پر مبنی ہے اقلیتیں دونوں ملکوں میں محفوظ نہیں ہیں لیکن دونوں اپنے اپنے ممالک میں انہیں حقوق و تحفظ دینے کے بجائے ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں انتخابات کے دوران ایک دوسرے کا خوب ذکر کیا جاتا ہے راحت اندوری کا یہ شعر ہند و پاک کی سیاسی منظر کشی کرتا ہے۔

سب کی پگڑی کو ہواؤں میں اچھالا جائے
سوچتا ہوں کوئی اخبار نکالا جائے

میڈیا جسے کسی زمانے میں جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا تھا آج وہی میڈیا اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے آج کا میڈیا اپنی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی خاص شخص یا قوم کی پگڑیاں اچھالنے میں ذرا سی بھی شرم محسوس نہیں کرتا ماضی قریب میں ہندوستانی میڈیا نے نظام الدین مرکز پر جس طرح نشانہ سادھا ہم اور آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔

اردو میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر گزرا ہو جس نے ایک بھی نعتیہ شعر نہ کہا ہو ڈاکٹر راحت اندوری نے بھی نعت گوئی کی حالانکہ نعتیہ مشاعرے بہت کم پڑھے ان کے نعتیہ اشعار میں حضور نبی کریم صلی علیہ وسلم سے سچی عقیدت و محبت کا جذبہ نظر آتا ہے جو مومن کے ایمان کا حصہ بھی ہے لکھتے ہیں۔

زم زم و کوثر و تسنیم نہیں لکھ سکتا
یا نبی ﷺ آپ کی تعظیم نہیں لکھ سکتا
میں اگر سات سمندر بھی نچوڑوں راحتؔ
آپ کے نام کی اک میم نہیں لکھ سکتا

ڈاکٹر راحت اندوری کی نعتیہ شاعری کے حوالے

سے فاطمہ حق اپنے ایک مضمون "راحت اندوری کی نعتیہ شاعری: ایک جائزہ میں لکھتی ہیں" اس میں شاعر کے شکستہ دل کی فریاد بھی شامل ہے اور ہر شعر بارگاہ نبوی میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بیتاب ہے مجھے کہنے دیجئے کی راحت اندوری کے نعتیہ شاعری کے مطالعے سے قارئین کے دلوں میں ایمان وآگہی کے نور کا چشمہ ابل پڑتا ہے اور روحانی کیف وسرور حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ راحت اندوری فنِ نعت نگاری میں ید طولی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا نعتیہ کلام خلوص ومحبت کے جذبے سے سرشار، عشق ویقین کی خوشبو سے معطر اور تسلیم ورضا کے رنگ میں رنگا ہوا ہے" فرماتے ہیں ۔

بند آنکھیں ہیں چارسو ہیں آپ ﷺ
اس اجالے کی آبرو ہیں آپ ﷺ
نعت پڑھتا ہوں اور لرزتا ہوں
ایسا لگتا ہے روبرو ہیں آپ ﷺ

زیارتِ دربارِ رسول صلی علیہ وسلم کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں ان کی خواہش تھی کہ زندگی میں ایک بار ہی سہی گنبد خضریٰ کی زیارت نصیب ہو جائے اور راحت صاحب کی یہ خواہش پوری بھی ہوئی شعر ملاحظہ ہو ۔

میں ہندوستان میں ہوں اور مدینہ پاس رہتا ہے
انگوٹھی دور رہتی ہے نگینہ پاس رہتا ہے
لگا رکھی ہے لو سرکار ﷺ کے دربار سے میں نے
اسی دربار سے جنت کا زینہ پاس رہتا ہے

ڈاکٹر راحت اندوری ساری زندگی اردو کی خدمت کرتے رہے تمام عالم میں اردو ادب وشاعری کا اقبال بلند کیا کئی کتابوں کے مصنف بھی ہوئے بحیثیت شاعر دنیا میں اپنا نام پیدا کیا لوگوں کے دلوں پر راج کرتے رہے طبیعت علیل ہونے پر 11 اگست 2020 کی صبح اندور کے ایک ہسپتال میں داخل کیا گیا کووڈ19 کی جانچ رپورٹ مثبت آئی راحت صاحب بندش قلب کے مرض میں بھی مبتلا تھے کم وبیش 70 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

رپوتاژ: ولی محمد زاہد ہریانوی
سکریٹری بزمِ چراغِ ادب، حیدرآباد

حیدرآباد: اُردو مسکن خواجہ شوق ہال، خلوت میں بزمِ چراغِ ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام، دکن کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر وناظم مشاعرہ جناب اسلم فرشوری کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ملک کے مختلف مقامات سے تشریف لائے شعرا اور مقامی نامور شعرائے کرام نے کلام سُنا کر سامعین کو محظوظ کیا، اہلِ ذوق حضرات کی تسکین کیلئے رپوتاژ پیش ہے۔

جشنِ غم روز مناتے ہیں سخن ور کتنے
ہم نے تو زخم بھی رکھے ہیں سجا کر کتنے
(سہیل عظیم)

بچاؤ گلشنِ ہندوستاں کو اے زاہد
تمہیں وطن سے محبت اگر زیادہ ہے
(زاہد ہریانوی)

اس تلخ زندگی کی حقیقت کو جھیلنا
مشکل اگر نہیں ہے تو آسان بھی نہیں
(زعیم ذومرہ، صدر بزم)

بے خودی سے چھا گئی دل پر مرے
اُف یہ لہراتی ہوئی آواز اُف
(ڈاکٹر معین افروز، ناظم مشاعرہ)

میں اکیلا بھی کہاں رہتا ہوں تنہائی میں
یاد رہتی ہے تری دل کے مری کھائی میں
(ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق)

میں اک ذرّہ ہوں ذرّے کی حقیقت کیا مگر خوش ہُوں
عظیم الشان صحرا سے مرا رشتہ نکلتا ہے
(ظہیر کانپوری، مہمان شاعر)

حسد غرور، کدورت سے صاف رکھئے دل
یہ وہ مرض ہیں جو اپنی دوا نہیں رکھتے
(خورشید فاروقی برہان پور، مہمان شاعر)

تکلیف جس سے تھی وہ حوالہ بدل دیا
میں نے کتابِ درد کا صفحہ بدل دیا
(سید مسرور عابدی، مہمان خصوصی)

دشت وحشت میں مجھے چھوڑ کے جانے والے
تیرا غم میرا نگہبان بھی ہوسکتا ہے
(صلاح الدین نیّر، مہمان خصوصی)

ہدف کچھ اور کہتا ہے کماں کچھ اور کہتی ہے
مگر پنچھی کی خونی داستاں کچھ اور کہتی ہے
اگر سچ پوچھو تو کلیاں ترستی ہیں تبسّم کو
مگر افسوس فکرِ باغباں کچھ اور کہتی ہے
(اسلم فرشوری، صدر مشاعرہ وسرپرست بزم)

افکارِ زاہد کی رسم اجراء بدست معروف شاعر صلاح الدین نیّر

بزمِ چراغِ ادب حیدرآباد کے زیرِ اہتمام اُدباء و شعراء کے بیانات اور کل ہند مشاعرہ

۳۰؍ڈسمبر ۲۰۲۰ء اُردو مسکن خواجہ شوق ہال خلوت حیدرآباد میں حافظ و قاری ولی محمد زاہد ہریانوی کے دوسرے شعری مجموعہ افکارِ زاہد کی رسم اجراء حیدرآباد کے معروف شاعر و صحافی جناب صلاح الدین نیّر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر صلاح الدین نیّر نے کہا کہ میں ذاتی طور پر زاہد ہریانوی کو ان کے کردار و خوش مزاجی کی وجہ سے بے حد پسند کرتا ہوں، ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی ہے' ہر شخص ہر دوست سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں۔ زاہد کے کلام کو پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا ہوں' مشاعرہ میں کچھ غزلیں سننے کے بعد کسی بھی شاعر کے شاعرانہ قدر و قیمت کا پوری طرح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا' پورا مجموعۂ کلام پڑھنے کے بعد شاعر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا صحیح تعین ہوتا ہے۔ میں زاہد ہریانوی کے دوسرے شعری مجموعہ افکارِ زاہد کی اشاعت پر اُن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مشہور ناظم مشاعرہ اسلم فرشوری سرپرست بزم چراغِ ادب نے کہا کہ زاہد ہریانوی کی شاعری کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ افکارِ زاہد کے مطالعہ سے زاہد ہریانوی کی شاعری کی بلندی اور معیار کا پتہ چلتا ہے اور ان کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا یہ ہے کہ یہ سخت ترین بات بھی نرم لہجے میں کہہ جاتے ہیں۔ شاعر عرفان جناب سید مسرور عابدی شرفی نے کہا کہ زاہد ہریانوی کی شاعری میں سلاست اور بلند خیال و مشاہدات کی فراوانی اوج پر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے حیات و کائنات میں نمودار ہونے والے انقلابات کو مفکّر کے ذہن اور مصوّر کی نگاہ سے دیکھا ہے یہی سبب ہے کہ ان کی غزل گوئی ہر لحہ ارتقاء پذیر دکھائی دیتی ہے۔ اُردو کے سینئر استاذ ڈاکٹر م ق سلیم صدر شعبہ اردو شاداں کالج حیدرآباد نے کہا کہ زاہد نے بچپن ہی سے علم دین کو سیکھا اور اس کی نشر و اشاعت میں آج بھی مصروف ہیں۔ انہوں نے حافظ و قاری ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کامل بھی کیا ہے انہی صلاحیتوں نے انہیں شعر گوئی کی طرف راغب کیا وہ اپنے وطن ہریانہ کو چھوڑ کر حیدرآباد آئے اور یہاں کا ماحول ان کو اس قدر پسند آیا کہ حیدرآباد انہوں نے کو اپنا وطنِ اقامت بنالیا اور یہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ زاہد ہریانوی میں شاعری کا جوہر ہے' لکھنے کا تخیل ہے' خیالات کی وسعت اور سوچ کا پھیلاؤ ہے یہ خداداد صلاحیت ہے جو قدرت کی عطا کردہ ہے۔ ڈاکٹر خواجہ فرید الدین صادق' زعیم ذومرّہ' اور مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی مدیر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا: اجلاس کے بعد دکن کے معروف شاعر و ناظم مشاعرہ جناب اسلم فرشوری کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ظہیر کانپوری کانپور (یوپی)' جناب خورشید فاروقی برہان پور مدھیہ پردیش' حیدرآباد کے سینئر شاعر جناب صلاح الدین نیّر مدیر خوشبو کا سفر' شاعرِ عرفان سید مسرور عابدی' جناب ڈاکٹر خواجہ فرید الدین صادق' جناب زعیم ذومرّہ' ڈاکٹر معین افروز' زاہد ہریانوی' سہیل عظیم' اور دیگر شعراء نے کلام پیش کرکے سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر معین افروز نے انجام دیئے۔ حاضرین محفل اور ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد نے اس اہم مجموعہ افکارِ زاہد کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش کی۔ رات تقریباً 10 بجے کنوینر مشاعرہ زاہد ہریانوی کے اظہارِ تشکر پر اس خوبصورت محفلِ مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدر آباد
Regd No: 180/2016

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّمَ القُرآن وَعَلَّمَہ۔ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد میں ۱۵ر جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ ٹرسٹیوں کے مشورے سے دوسو (200) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جارہی ہے، جس کی مجموعی قیمت 24 رلاکھ روپے ہے، فی گز 12 رہزار روپے ہے۔ 10 رلاکھ روپے بطور بیع نامہ ادا کیا گیا ہے۔ اس زمین پر مصلیٰ، مدرسہ، لائبریری، دفتر اور ایک آڈیٹوریم بنانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے اور مرحومین کے صدقہ جاریہ کے لیے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرماہیں۔

Bank : IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number : 1327104000065876
A/c Name : Shibli International Educational and Charitable
IFSC Code: IBKL0001327, Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد